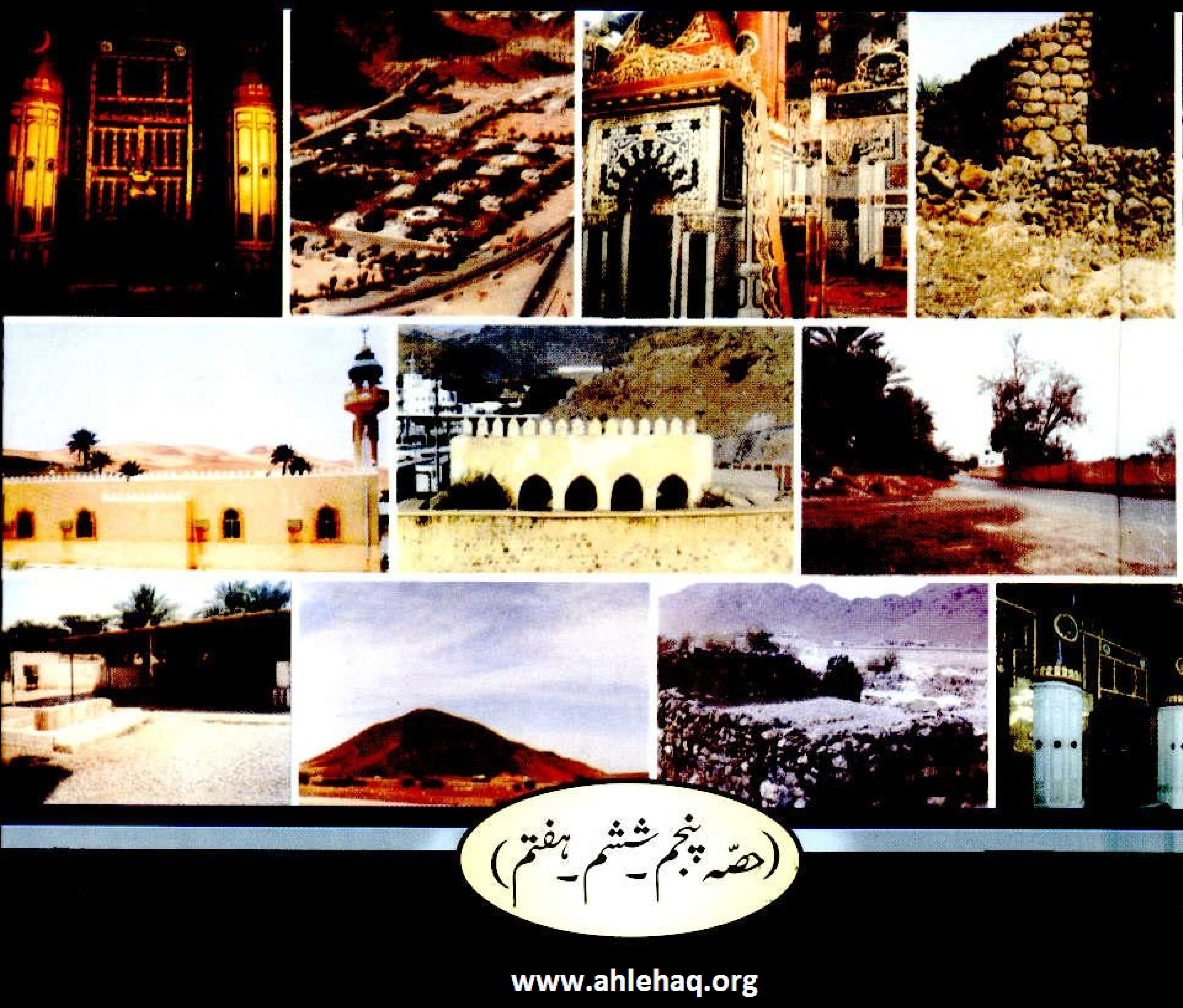
حسین کمپوزنگ، نادر و نایاب قدیم و جدید
تصویروں کے ساتھ پہلی بار تصحیح شدہ جدید ایڈیشن

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ



(حصہ پنجم ۔ ششم ۔ ہفتم)

(تصحیح شدہ، جدید ایڈیشن)

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد چہارم

خوبصورت کمپوزنگ۔ اعلیٰ کاغذ و طباعت
اور نادر و نایاب قدیم و جدید رنگین تصویروں اور نقشوں
کے ساتھ پہلی بار۔۔۔ تصحیح شدہ، جدید ایڈیشن

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جلد چہارم

اِدارہ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۳۲۴۴۱۲، ۷۳۲۴۴۸۵، فیکس ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۴۸۵

۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ
چوک اُردو بازار، کراچی فون ۲۷۲۲۴۰۱

سیرۃ النبی ﷺ

(تصحیح شدہ جدید ایڈیشن)

اشاعت اول : جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ ستمبر ۲۰۰۲ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

ادارہ اسلامیات
پبلشرز۔ بک سیلرز۔ ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن۔ مال روڈ۔ لاہور فون ۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+
۱۹۰- انارکلی۔ لاہور- پاکستان.........فون ۷۲۴۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵
موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان......فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ پنجم)

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ ششم)

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ ہفتم)

بسم اللہ الرحمان الرحیم

﴿ سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ۝ وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾

دیباچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی' آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیا ہے۔

موضوع:

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام وانواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت وحکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی ایک خطا کار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے۔ اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقی ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ "جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفس خطا کار کا قصور ہے۔"

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق:

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرت کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے' صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے' اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاد علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا۔ ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں۔

"چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آ جائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر' غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرہ المعارف النبویہ موزوں ہوگا۔ گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا" (بنام مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی صفحہ نمبر ۱۰۴)

سیرۃ جلد اوّل کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان "منصب نبوت" رکھا تھا اور لکھا تھا۔

دوسرا حصہ منصب نبوت کے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم، عقائد اور اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق

ہے۔اس بناپر''منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامرو نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے۔اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق وعادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔'' (جلداول طبع اول صفحہ۴۷وطبع دوم صفحہ۹۷)

گذشتہ چوتھی جلد، یا پانچویں جلد اور آئندہ دوجلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل وتشریح ہیں۔منصب نبوت عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں۔اخلاق ومعاشرت کے نقطوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اوامرونواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں ساتویں جلد ہوگی۔ان میں سے ہرموضوع کی تفصیل وتشریح میں مصنف اول کی ایماء کے مطابق قرآن مجید پرپوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلوکو بچابچا کرمقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہرایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کرتمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد''مرا'' گفت ہماں می گویم

حسن قبول:

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کوحسن قبول کی سندعطافرمائی۔

قبول خاطر دلہا خدادادا است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا مجھ سے فرمایا''یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی۔''ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی۔علاوہ اس کے کہ اس کی ہرجلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کرآج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پرکوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کوسامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد للہ پیدا ہوگیا ہے اور اس کی تعلیم ومطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہوگیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد:

اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس

کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تار نفس محبت رسول ﷺ کے دامن سے وابستہ تھا یعنی ملت محمدی کی خادمہ اور امت محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مر چکا بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں۔ اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی۔ مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت ۔۔۔ کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی ۔۔۔ تو اس کے واسطے حاضر میرا دل ہے میری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل ۔۔۔ کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

جب اس ''فقیر بے نوا'' کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے۔'' آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ زر افشانی کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا۔ وہ تاج و تخت ایک ایسے جواں بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی۔ سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں۔ ﴿خلد اللہ ملکہٗ﴾

۱۹۱۸ء ۱۳۳۶ھ میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع مظفر الملک والممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ پیش گاہ کی خسروی میں پیش کیا۔ حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین محبوب العٰلمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفٰی علیہ الوف التحیات والصلوت کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے۔ سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا بے حد مدد ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گذر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر ۔۔۔ ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف
سید سلیمان ندوی
شبلی منزل اعظم گڑھ
۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

عمل صالح

﴿ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

محمد رسول اللہؐ جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔ کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی۔ اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے۔ ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل۔ کا کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے۔ لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے۔ مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے فرمایا:

﴿ وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ (عصر۔۳۔۱)

زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴾ (التین۔۴۔۵)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔ لیکن جو ایمان

لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں؟ وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے۔ یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے یہ فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ (بقرہ۔۸۲)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے۔ فرمایا

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۶۹)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ان پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل وقومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین ودنیا کی بہتری اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا۔

﴿ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ﴾ (کہف۔۸۸۔۸۷)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹ کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بھلائی کا بدلہ ہے۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ ﴾ (انبیاء۔۷)

تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْ ۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴾ (مریم۔۴)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں وہ اس استحقاق سے بھی مرحوم ہیں۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ٥ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ (شوریٰ۔۳۔۲۲)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑی مہربانی ہے، یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾ (کہف۔۱۲)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کی مہمانی کے لئے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ (کہف۔۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے۔ کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا، وہ بارہا اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے۔

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ (حج۔۵۶)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں

پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ (نور۔۷)

تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہیں سے تھا۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (فتح۔۴)

اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکو کاری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

﴿ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۳)

کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکو کار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط [1] میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکو کاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے مگر پیغمبر اسلامؐ کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو۔ یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی اور

فوزوفلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے لئے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے۔البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہرحال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہوسکتی ہے اور دوسرے کے لئے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے۔اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں:

''عمل صالح'' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔عبادات،اخلاق،معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔مگر فقہاء نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں،دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے۔اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل وتشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ ﴾ (بقرہ۔۳)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے۔لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ''راہب متبتل'' کی صورت میں تھا۔عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے۔

﴿ منارة ممسىٰ راهبٍ متبتلٍ ﴾

دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کے نام کا چراغ۔

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے۔ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی۔وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل مناتا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔یہودیوں پر اس نے بے حکمی نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔[1]

یہودی جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے۔انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا

[1] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹، ۱۱ اور سورۂ حدید رکوع ۴۔

ہے۔لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں اسی لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا۔

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرَاهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (حدید۔۴)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰؑ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نبھانا چاہئے تھا نہیں نباہا۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لئے قرآن نے ان کو بار بار کہا۔

﴿ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ﴾ (نساء۔۲۳ و مائدہ۔۱۰)

اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ﴿و يقتلون النبيين﴾ بقرہ وآل عمران ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے۔

﴿ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ﴾ (مائدہ۔۶)

اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تبلیغ کی۔

﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۚ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۚ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ

السَّبِیۡلِ﴾ (مائدہ۔۷۷۔۷۵)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس۔اس سے پہلے اور پیغمبر گذر چکے اور اس کی ماں ولی تھی، دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لئے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھ وہ کدھرا لٹے جاتے ہیں۔(ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع۔اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے کہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے۔

ان کی حالت یہ تھی۔

﴿اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ (توبہ۔۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنالیا تھا۔

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں ان میں حضرت عیسیٰؑ ،حضرت مریمؑ اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔عبادت گذار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے۔صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم وتکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواجؓ مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن وخوبی کو بیان کیا۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''خدا یہودونصاریٰ پر لعنت بھیجے انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا،تم ایسا نہ کرنا،ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کردیتے[1] تھے۔''

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی وزوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق وتائید میں ہیں۔خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ ،حضرت مریمؑ، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک روم کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درودیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مومی بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بےخبر تھے۔لات، عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔خانہ کعبہ

---

[1] دیکھو سورہ مائدہ رکوع ۹، ۱۱ اور سورہ حدید رکوع ۴۔

یعنی خلیلؑ بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ "اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں، اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔" [1]

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت ﷺ سن رہے تھے۔ [2]

﴿ واللہ لو لا انت ما اھتدینا ﴾ ﴿ و لا تصدقنا و لا صلینا ﴾

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی۔ بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰؑ حضرت مریمؑ اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوشس اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (بقرہ۔۳)

لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتب الٰہی کے ایمان داروں کو آواز دی گئی۔

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ (آل عمران۔۷)

اے کتاب والو! آؤ تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے۔

﴿ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ﴾ (آل عمران۔۲۰)

خداوند! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو

[2] صحیح مسلم باب خیبر شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے۔

ہمارے گناہ معاف کر۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الٰہی میں کی گئی تھی۔

خداوندا! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے۔ خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی '' [1]

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیوں کہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت:

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوت محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ:

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ (مریم۔٦)

آسمان وزمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع و قیام کی مستحق ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لئے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے۔

﴿ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (انعام۔٢٠)

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا۔

﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾ (کافرون۔١)

اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ تمارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔

---

[1] صحیح مسلم و جامع ترمذی غزوہ بدر۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں:

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب [1] نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت [2] نہ دیوتاؤں، دیبیوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت [3] نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم [4] نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید [5] ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے۔ اس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے۔ اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں:

اسلام میں عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں، نہ حاخام ہیں، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے آپ عرض حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا۔

﴿ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (مومن۔ ٦)

تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں:

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش دلفریب مؤثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا۔ کہیں ناقوس اور قرنا کی پررعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور لیکن دین محمدی کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل

---

1. جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔
2. جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔
3. جیسا کہ ہندوؤں عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے۔
4. جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے۔
5. یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیر کا سہارا نہیں لیا تا کہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں:

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت۔ وہ دیر و حرم معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا '' مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں من جملہ ان کے ایک یہ ہے۔

﴿ و جعلت لی الارض مسجدًا ﴾ [1]

اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجا لا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو۔ [2]

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے۔ لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے۔ اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے۔ وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی۔ کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی خدا ہے۔ چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں۔ جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجدا و طهورا۔

[2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیت۔

انسانی قربانی کی ممانعت:

بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر، یا دریا میں ڈوبا کر، یا آگ میں جلا کر، یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے۔ اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اور مارا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔[1]

حیوانی قربانی میں اصلاح:

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔ عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے۔ کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے۔ یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا (احبار ۲۱۔۶) ہے۔ بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔ پیغام محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (حج۔۳۸)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لئے جو موقع حج پر نہ گئے ہوں مقام حج کی یاد کے لئے قربانی مسنون کی گئی ہے تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ۔

غریبوں مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴾ (حج۔۳۴)

ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے ان کو روزی کی تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنا دے۔

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (حج۔۳۶)

اور قربانی کے جانور کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بہت فائدے ہیں۔ ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو تو جب وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو۔ اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ ﴿وَمَآ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ﴾ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے۔ اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا'' خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو' نیک کام خدا کے لئے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ [1] غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں۔ صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دیبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت:

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔ عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے۔ اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام عتیرہ تھا۔ اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کر دی۔

﴿ قال لا فرع و لا عتیرہ﴾ [2]

آپ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں

---

[1] ابوداؤد باب فی العتیرہ جلد دوم صفحہ ۵۔

[2] ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵۔

استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی۔

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ﴾ (مائدہ۔۱۴)

نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا

﴿ لا عقر فی الاسلام ﴾ [1]

اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہوکر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا۔ جس کے اونٹ ختم ہوجاتے یا ذبح کرنے سے انکار کردیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا۔ [2]

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں:

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت، اور ہندوؤں میں جوگ، اس اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کرلیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترکِ دنیا کرکے اہل وعیال اور زن وفرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا۔ لیکن نبوت محمدی نے راز آشکار کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن وفرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (بقرہ۔آخر)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز باب کراهية الذبح عند القبر جلد ۲ ص ۴۲۔

[2] ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵۔

متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا۔

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (بقرہ۔۴۰)

خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرما دیا۔

﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ (آل عمران۔۱۰)

جس کو (زادراہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (حج۔۱۰)

تمہارے لئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ انّ هذ الدّين يسر ولن يشادُ الدين احدٌ الا غلبَهُ ﴾ [1]

یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

اور فرمایا۔

﴿ انما انا بعثت بالملة السمحة او السهلة الحنيفية البيضاء ﴾ [2]

میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہوتا ہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا۔

﴿ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ﴾ (حدید۔۴)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ (اعراف۔۴)

پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنایا کس نے حرام کیا۔

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بی بیوں کی خوشنودی مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا۔ خدا نے فرمایا

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۲ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی۔

[2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶۔

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (تحریم۔۱)

اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا تو اس کو اپنی بیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے، اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحابہؓ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد ترکِ لذائذ اور ریاضیات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔ قدامہؓ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یارسول اللہ ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں'' یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ [۱]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ''اے عبداللہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے۔ [۲]

اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی۔ آپ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ ''کیوں عثمان تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے۔'' عرض کی ''خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں۔ میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔'' فرمایا میں سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ [۳]

قبیلہ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ان کو پہچان نہ سکے۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا ''تم خوش رو تھے تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی۔'' عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔'' فرمایا ''تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔'' انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی۔ انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیئے۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔ [۱] ایک دفعہ چند صحابہؓ نے

---

۱ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۲ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۳ ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب مایؤمر بہ من القصد فی الصّلوۃ۔

ازواجؓ مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا ﷺ کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔ تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا، کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا'' خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں۔ [۲]

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ [۳]

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے۔ صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے۔ آپ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے افطار نہ کیا۔ آپ نے دو دن روزہ رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا۔ آپ نے افطار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزہ رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں۔ فرمایا'' تم میں سے کون میری طرح ہے؟ مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔ [۴] اسی لئے اسلام میں عام امت کے لئے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گذر ہوا دیکھا تو ایک ستون میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے۔ رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارا کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا'' یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے۔ جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔'' [۵]

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں

---

[۱] ابوداؤد باب صوم اشہر الحرم۔
[۲] صحیح بخاری کتاب النکاح۔
[۳] صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب النکاح۔
[۴] صحیح مسلم کتاب الصوم۔
[۵] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابوداؤد عن انس جلد اول صفحہ ۲۰ طبع میرٹھ باب الاقتصاد فی الاعمال۔

سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ "یہ رات بھر نہیں سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔" [۱]

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

﴿ اکفلوا من العمل ما تطیقون فان اللّٰہ لا یملّ حتّٰی تملوا فان احبّ العمل الی اللّٰہ ادومہ وَاِنْ قلّ ﴾ [۲]

اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اُکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگر چہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے۔ بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی۔ عقبہ نے آ کر آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا۔ آپ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔ [۳] اسی طرح آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے۔ آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ نے فرمایا "میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو لو۔" [۴] ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو"۔ [۵]

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ نے فرمایا "اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔" [۶]

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ آپ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔" [۱]

---

۱ جمع الفوائد بحوالہ صحیحین و مؤطا و نسائی۔

۲ ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ۔

۳ ابوداؤد و مسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور۔

۴ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۸۲۔

۵ ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن جارود کتاب الایمان والنذور۔

۶ صحیح بخاری ابوداؤد و ابن جارود کتاب الایمان والنذور۔

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ نے فرمایا۔

﴿ لا تشددو اعلی انفسکم فانما هلك من كان قبلكم بتشديد هم على انفسهم و ستجدون بقايا هم في الصوامع و الديارات ﴾ ۲

اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

﴿ لا صرورة في الاسلام ﴾ (ابوداؤد)

اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں:

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کی بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے۔ جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں۔ غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں بلکہ ادائے فرض ہے۔ ترک عمل نہیں بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے فرمایا "اے فلاں تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے"۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں۔ ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آکر عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھ کو ایک غار ہاتھ آ گیا ہے جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کرلوں۔ آپ نے فرمایا "میں

۱ صحیح بخاری ابوداؤد و ابن جارود کتاب الایمان والنذور

۲ جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابوداؤد صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال

یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔'' [1]

اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن' گوشہ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی۔ [2]

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانا ہے۔اسی لئے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴾ (مومن۔۱)

جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶

۲ اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے۔ایک اس شخص کے لئے جس میں فطرۃً بدی ہے جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے۔صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آ کر آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا ''ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔('' صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء) اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آ جائے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے۔ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے۔'' (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء) گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں۔پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا۔

﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ﴾ (انبیا۔۲)

جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔

سعادت منداور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا۔

﴿ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۲)

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور واستکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں۔اس بنا پر اگر غرور واستکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے۔اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا۔اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امرِ فارق ہے۔قرآن پاک میں یہ نکتہ جا بجا ادا ہوا ہے۔

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴾ (لیل۔۱)

دوزخ سے وہ پرہیز گار بچا لیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا بدلہ اس کو دینا ہو۔بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے،وہ خوش ہوگا۔

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے جو تم خرچ کرو۔

﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ﴾ (انسان۔۱)

ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴾ (ماعون۔۱)

پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے کہ

﴿ انما الاعمال بالنیات ﴾ (صحیح بخاری و مسلم)

اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

اسی کی تشریح آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے۔

﴿ لکل امرءٍ مانوی فمن کانت هجرته الی اللّٰه و رسوله فاجره علی اللّٰه و من کانت هجرته الی دنیا یصیبها او امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه﴾ (بخاری باب اوّل)

ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے یا کسی عورت کے لئے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے۔ اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے عبادت ہے۔ اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔

تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ۔۳)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصول تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔''[۱] اور قرآن نے بھی تقوی القلوب [۲] ''دلوں کا تقویٰ'' کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے مثلاً نماز، دعا، قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے، عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو لیکن

۱۔ مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم ظلم المسلم۔

۲۔ حج رکوع ۳۔

اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت خوشنودی اور رضا مندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعتہً مٹا دیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کئے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خودغرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے[1] کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو۔ غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾

(بقرہ۔۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے۔ ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ (ھود۔۱۰)

اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھو۔

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا

﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ ﴾ (مریم۔۴)

اس کی عبادت کر اور صبر کر۔

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى ﴾ (بقرہ۔۳۶)

اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

﴿ كُلّ معروف صدقة ﴾ (بخاری کتاب الادب)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔

ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔

﴿ تبسمك فی وجه اخیك صدقة ﴾

تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے۔

﴿ و اماطة الاذی عن الطریق صدقة ﴾

راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹادینا بھی خیرات ہے۔

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت، بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے' فرمایا۔

﴿ الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰه و کالذی یصوم النهار و یقوم اللیل ﴾ (بخاری' کتاب ادب)

بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا۔

﴿ الا اخبر کم بافضل من درجة الصیام والصلوٰة والصدقة ﴾

کیا میں تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟

صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ! ارشاد فرمایئے، فرمایا:

﴿ اصلاح ذات البین ﴾ [1]

وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے۔ اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا تو ابوذرؓ نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔ آخر انہوں نے افطار کیا۔ رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا ''اے ابوذرؓ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو''۔ حضرت ابوذرؓ نے حضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی۔ آپ نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا۔'' [2]

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یارسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کونسا کام ہے'' فرمایا خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ ارشاد ہوا

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲۔

[2] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف صفحہ ۹۰۶۔

جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔ انہوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا ''پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو اس کا کام کر دو''۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ فرمایا ''تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو''۔ [۱]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ ''میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا'' وہ عرض کریں گے ''خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے'' فرمائے گا کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا۔ اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔ ''اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا'' وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ وہ فرمائے گا تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا۔ اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ ''اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی'' وہ کہے گا ''اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔'' فرمائے گا ''تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر کرتا تو تُو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔ [۲]

اس مؤثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں آپ نے انہیں بتایا کہ اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے اس کا تم کو ثواب ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب ہے۔ [۳] ابو مسعودؓ انصاری سے ارشاد فرمایا ''مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔'' [۴] غریب و نادار صحابہؓ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی، کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجا لاتے ہیں جو ہم نہیں بجا لا سکتے۔ فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا ''یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے'' فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔'' [۵]

محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسن عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی تو بر تو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی نے بالکل

۱۔ ادب المفرد امام بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ۔
۲۔ ایضا باب عیادۃ المرضیٰ۔
۳۔ ادب المفرد باب یو جرفی کل شی۔
۴۔ صحیح بخاری کتاب النفقات۔
۵۔ ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ۔

صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض وغایت عبادت الٰہی قرار دی ہے۔

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾ (ذاریات۔۳)

میں نے انسانوں کواور جنوں کواسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اوراس کی خوشنودی کی طلب ہو۔اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے۔یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز ،روزہ ،زکوۃ اور حج۔اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اوران کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اوران سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اوراچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں اس لئے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے،ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

۲۔ وہ تمام اچھےاور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اورآرام کے لئے کرتا ہے۔صدقہ اورزکوۃ ہے۔

۳۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا' کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کواس تن پروری اور مادی خواہشوں کو نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں،روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار وقربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

دنیائے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری اوراخوت کی مجسم تشکیل وتنظیم مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اوراس مرکز کی آبادی اور کسب روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام اعمال اوراچھے کام انہی اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے (۱) توحید ورسالت کا اقرار کرنا (۲) نماز پڑھنا (۳) روزہ رکھنا (۴) زکوۃ دینا (۵) حج کرنا۔"[۱] پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اوراچھے کاموں کو محیط ہیں۔انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز،زکوۃ،روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں

[۱] صحیح بخاری وصحیح مسلم کتاب الایمان۔

بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب ہیں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے۔ یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرنِ اوّل کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوٰتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ ﴾ (نور-۷)

اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنالے گا۔

ایمانِ کامل اور اعمالِ نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفاء کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے، مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے[1] اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی ﷺ جلد اوّل صفحہ ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر کلمۃ واحدۃ یعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین بھا البحر۔

نماز

﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ﴾

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر وغریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار وتندرست، سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو۔ اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔[1] اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔[2] اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔[3]

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل زبان اور ہاتھ سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان ورحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد وثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم وجان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین مضطرب قلب کی تشفی، اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا وفریاد کرنا، اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جابجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرضِ نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کی سامنے پیش کرے، غرض عبادت' روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں۔ اسلام میں اگر حمد وتسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا، پارسیوں میں زمزمہ، اور ہندوؤں میں بھجن ہیں، اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان

---

[1] نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی۔

[2] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب۔

[3] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جواز صلاۃ النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجهت۔

اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب[1] سے زیادہ نمایاں ہے۔حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾(ابراہیم۔۶) اے ہمارے پروردگار تا کہ وہ نماز کھڑی کریں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ اے میرے پروردگار مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا۔حضرت اسماعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے۔﴿وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ﴾ (مریم۔۴)اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔حضرت شعیبؑ کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں۔﴿أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا﴾ (ھود۔۸) کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں۔حضرت لوطؑ حضرت اسحاقؑ حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے۔﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ﴾ (انبیا۔۵)اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی۔حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں۔﴿يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾(لقمان۔۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر۔حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي﴾ (طٰہٰ۔۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (یونس۔۹) اور نماز کھڑی کیا کرو۔بنی اسرائیل سے وعدہ تھا ﴿إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ﴾ (مائدہ۔۳) میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے۔﴿وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ﴾(آل عمران۔۴) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں ﴿وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ﴾(مریم۔۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

﴿مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾ (آل عمران۔۱۱۳)

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

---

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ خدا کا نام لینا تھا چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا (پیدائش ۱۲، ۴) حضرت اسحٰقؑ نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶۔۲۵) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا (زبور ۱۱۶،۱۷) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی، اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لئے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ صلوٰۃ کے ہم معنی ہے۔اس لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے (متی ۱۷۔۲۱ اور متی ۲۳۔۴۱)۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تہہ بند باندھ لو، یا چادر اوڑھ لو۔ یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو (ص۴۷) تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (ص۴۷) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو (ص۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو (ص۱۱۴) میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے (ص۸۴) ان حوالوں [1] سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔

عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں۔ یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے۔ [2] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے؟ کہنے لگے جدھر رخ کر لیا۔ [3] عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے۔ [4]

وادرکن اعجازًا من اللیل بعدما اقام الصلوة العابد المتحنف

(اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ میں اس وقت کے بعد جب کہ عبادت گذار حنفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ [5]

دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے۔ الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی۔ اس کی شکل و صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان

---

1. کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیئے گئے ہیں۔
2. ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل۔
3. صحیح مسلم فضائل ابی ذر ۱۲۔
4. لسان العرب لفظ حنف ۱۲۔
5. دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ) ۱۲۔

کے صحیفوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔ جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم و رواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا۔ سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے اس کو یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل وصورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴾ (اعراف۔۱۷)

ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پروا نہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیزگار ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو برباد نہیں کرتے۔

سورۂ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ (مریم۔۴)

ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کر دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے۔ مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں۔

﴿ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۵۸)

اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا۔ حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے

دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ﴾ (انفال۔۴)

اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ [۱] پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو ولعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے۔

﴿ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ﴾ (علق۔۱)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے۔ آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے [۲] کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے [۳] اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ [۴] اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ابن اسحٰق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی۔ اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ [۵]

الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے۔ ان کی نمازیں بالعموم اخلاص و

---

۱ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

۲ ایضاً۔

۳ صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکر۔

۴ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی۔

۵ سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ماافترض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ۔

اثر سکون ودلجمعی خشوع وخضوع اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم:

آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ (مدثر۔۱) اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ، اور ہشیار کر، اور اپنے رب کی بڑائی بول رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتے ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا، اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے دھکیل کر نیچے گرادیا۔ صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام قرار دیا اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصلی حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان وآداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع وخشوع، راز ونیاز اور اخلاص واثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل وصورت اور روح وحقیقت دونوں کے ساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ:

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ﴾ (بقرہ۔۳۱)

نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

﴿وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (انعام۔۱۱)

اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (معارج۔۱)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (مومنون۔۱)

اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا

﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (طہ۔۸)
اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔
نماز کیسی ہونی چاہئے؟ فرمایا۔
﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۱)
اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔
تعریف کی گئی کہ
﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)
کامیاب ہیں وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔
حکم ہوا کہ
﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ (اعراف۔۷)
تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔
﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (اعراف۔۷)
اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو۔
﴿ وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (اعراف۔۳)
اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔
اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ:

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرار عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ معلموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گذر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضہ الٰہی کو دین کامل میں ایسی منظم واضح مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔
یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی

ہے۔اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت [1] اور اس کا ترک کفر کی نشانی [2] بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستان قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔ [3]

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے چنانچہ سورہ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا۔ ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ (روم۔رکوع ۴) اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (روم۔۴)

اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا۔آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا۔لیکن نماز کے متعلق فرمایا جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نماز دل کی روشنی ہے اپنی نسبت فرمایا ہے نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے'' یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے، اور نماز آب زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے۔آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے۔ کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے۔عین اس وقت جب جناب رسالت پناہؐ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے آپ فرما رہے تھے نماز اور غلام۔ [4]

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے و اذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی (نساء۔۲۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون (ماعون۔۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں

[2] کفار کے بارے میں ہے لم نك من المصلین (مدثر۔۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے۔ یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔

[3] کتب صحاح واقعات معراج و اسراء و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

[4] یہ تمام حدیثیں کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔

نماز کی حقیقت:

نماز کے لئے اصل عربی لفظ ''صلوٰۃ'' ہے۔ صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں ''دعاء'' کے ہیں اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے۔ معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمك اللّٰه کہو۔ اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی۔ معاویہؓ بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی انہوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا۔ صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا۔ معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا۔ اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ نماز ہو چکی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا؟ لوگوں نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ ''نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے۔ اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں۔'' [۱] حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا ﴿اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ﴾ دعا عبادت کا مغز ہے اور حضرت نعمانؓ بن بشیر انصاری روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ دعا ہی عبادت ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی۔ [۲] جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے۔

﴿ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴾ (مومن۔ ۶)

مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے۔

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''بہترین عبادت دعاء ہے''۔ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے یعنی خدا کی یاد، فرمایا

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾ (طہ۔ ۱)

اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ (اعلیٰ۔ ۱)

کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ یہ دو روایتیں ہیں ہم نے ان دونوں کو جمع کر لیا ہے

[۲] یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب الدعاء میں اور مستدرک حاکم کتاب الدعا میں بھی ہے۔

انسان کو اپنی روحانی تڑپ دلی بے چینی قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا۔

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (رعد۔۴)

ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةَ ﴾ (بقرہ۔۵)

ثابت قدمی اور نماز (یا دعاء) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگوں ہے۔ آسمان زمین چاند ستارے دریا پہاڑ جنگل جھاڑ چرند پرند سب اس کے آگے سر بسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح و نماز ہے۔

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ (بنی اسرائیل۔۵)

اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ (حج۔۱۸)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج چاند تارے پہاڑ درخت جانور اور بہت سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا (یوں کہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرنگوں ہے لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گذار ہے کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی لیکن انسان ذاتی ارادہ واختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے۔ اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع وفرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت وانقیاد اور بندگی وسرافگندگی کی دعوت دیتی ہے۔ جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض وغایت:

نماز کی روحانی غرض وغایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تا کہ نفس وروح اور دل ودماغ پر اس کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی وبے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر

ہونے کا تصور نا قابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ ونیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخران سے بالکل باز آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر ایمان اسلام کی حقیقت دریافت کی۔ آپ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یارسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔[1] حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ اس کو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے۔ نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ[2] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ (عنکبوت۔۵)

اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں۔ بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ (اعلی)

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے۔ اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے۔

﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (فاطر۔۳)

تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب البزاق فی الصلوٰۃ، مسلم باب المساجد مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۴ و جلد ۳ صفحہ ۱۷۶ و صفحہ ۱۸۸ وغیرہ۔

[2] مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۶ و صفحہ ۶۷ و صفحہ ۱۲۹۔

دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا، اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا، وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا، اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

بے شک انسان بے صبرا بنا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ "اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس پر میل رہ سکتا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ ارشاد ہوا کہ "نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو" [۱]

ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی۔ اس پر یہ آیت نازل [۲] ہوئی۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴾ (ھود۔۱۰)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیرووں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت:

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ نفسیات یا دماغی کیفیات کہتا ہے اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب

[۱] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے کنز العمال (جلد ۴ صفحہ ۶۷ و ۶۸) میں حاکم احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔

[۲] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ و تفسیر سورہ ہود۔

شکل وصورت اور ماحول (گردوپیش) نہ اختیار کریں؟ تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم وآداب اور قواعد وضوابط مقرر ہیں۔ معبدوں ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت وتقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون وخاموشی، ادب ولحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست وبرخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ شاہانہ رعب وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسوں اور سلطان درباروں میں فوجوں کے پرے، قوی ہیکل چوبدار، عصابردار، نقیب وچاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت وتاج، علم وپرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور ومبدم دورباش اور نگاہ روبروکی پررعب صدائیں ضروری ہیں۔ کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون وخاموشی مقام کی سادگی وصفائی، شوروغوغا اور شہرو بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں۔ بزم عروسی کے لئے رنگ وبو، نوروسرور، گانا بجانا اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے۔

انہی طبعی ونفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات وآداب وقوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ نماز سے مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ وانابت، پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی اور خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار، نیز دل ودماغ اور نفس وروح میں پاکی صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو۔ مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کئے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے۔ اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پید ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی وپاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی وپاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا۔ یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری وساری ہے۔ اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کردے گا اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی کھیل میں فریقین کی ہم رنگی وہم لباسی فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہم قدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہوکر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے اسی لئے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے۔ نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح

واضح ہے غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ نماز کے آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکرودعاء وتسبیح کے دو طریقے:

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع وخشوع، ذکر الٰہی، حمد وثنا، اپنے گناہوں پر ندامت واستغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید وشرط کے بغیر ادا کر سکے اس کا نام عام تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی ہے جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ﴾ (نساء۔۱۵)

پس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ کی یہی حالت تھی خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

جو کھڑے بیٹھے لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے فرمایا۔

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (نور۔۵)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید وفروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے:

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل وصورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر وفکر اور تسبیح وتہلیل انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ

سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظام وحدت کا اصول:

اسلام کے عام فرائض واحکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے۔ اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے۔ یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ، اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل وصورت آئین وطریق اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کرسکتی تھیں۔ نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت محمدی کو قبول کیا فرض تھی اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کرلے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح واجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت وشکل میں واحد اعمال وافعال کا صدور کرایا جائے چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظام کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم وانجمن کی وحدت، کسی مملکت وسلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہوسکتی ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات:

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض وغایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہوجاتا ہے خوف میں زرد پڑ جاتا ہے خوشی میں کھل اٹھتا ہے غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہوجاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں۔ اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال وحرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال واعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ ونیت اوراس کے دلی جذبات واحساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کرسکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ وبرباد ہوجاتی ہے۔ اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اوراس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض والتجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کی مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جز خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق ورازق اور اس ارحم الرحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم وجان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال وحرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اوراس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں کھڑے ہوجاتے ہیں، جھک جاتے ہیں زمین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ نماز کے بھی یہ تین رکن ہیں چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی کھڑے ہوجانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)

ارکان نماز:

معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملت ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر وتطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی۔

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ (حج۔۴)

اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کھڑے ہونے والوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک و صاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا:

﴿ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۵)

اے مریم اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہوکر بندگی کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نماز مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب:

جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور اس میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے موخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجدہ سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

﴿ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ﴾ (نساء۔رکوع ۱۵)

جب تو ان میں ہے تو ان کے لئے نماز کھڑی کرنی تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لئے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے پس لامحالہ رکوع، قیام وسجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکان سہ گانہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع پھر سجود۔

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظ کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم ورواج کے مطابق کر دیئے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام:

'' پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا'' (پیدائش ۱۸۔۲۲)

رکوع:

''اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند '' (پیدائش ۱۸۔۲)

سجدہ:

''اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کئے'' (خروج ۔۴۔۲۱)

''تب ابرہام (ابرہیم) منہ کے بل گرا اور خدا سے ہم کلام ہو کر بولا'' (پیدائش ۱۷۔۳)

''تب ابرہام (ابرہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لئے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا'' (پیدائش ۲۲۔۵)

''تب اس مرد (حضرت اسحاقؑ کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام

کا خدا مبارک ہے" (پیدائش ۲۴۔۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤدؑ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا" (۲ سموال ۱۵۔۳۲)

زبور میں حضرت داؤدؑ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں۔

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا" (زبور ۵۔۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے۔ موجودہ انجیل میں دعا اور نماز کا ذکر متی ۶۔۵ و ۱۷۔۲۱ و ۲۶۔۳۶ مرقس ۱۴۔۲۳ ولوقا ۲۲۔۴۱ وغیرہ میں ہے طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲۔۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶۔۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے کھڑے ہو کر توراۃ زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے۔ قرآن پاک کی شہادت ہے۔

﴿لَيْسُوا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ (آل عمران۔ رکوع ۱۲)

وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں [1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آ رہی تھی چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے" [2]

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

---

[1] فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۷ مصر۔

[2] مضمون صلوٰۃ جلد ۴ صفحہ ۹۶۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ o فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ۔۳۱)

نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اس کی تفصیل سورہ نساء میں ہے اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے۔

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ط فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (نساء۔۱۵)

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں اوّل یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح وتہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر وفکر تسبیح وتہلیل حمد وثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے گو اس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہؓ کو کس طرح کی نماز سکھائی کیوں کہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف وموافق کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لئے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (بقرہ۔۳۱)

نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ (اعلیٰ۔۱)

اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (مدثر۔۱)

اور اپنے رب کی بڑائی کر۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد وثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں۔

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ (طور۔۲)

اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (مزمل۔۲)

قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ، وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴾ (اسرائیل۔۱۲)

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور نہ بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کر اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بہ تمام وکمال مذکور ہے اس لئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں اس کے بعد قرآن میں جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں۔ پھر خدا کی سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں۔

﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۵)

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾

(حج۔رکوع ۱۰)

اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴾ (واقعہ۔۲۔۳)

تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِّ عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ (اعلیٰ۔۱)

اپنے برتر رب (ربِّ اعلیٰ) کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے۔ [1]

قیام رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورہ حج (۴۔ ذکر ابراہیمؑ) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے سورہ نساء (۱۵۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے۔ پہلے کھڑا ہونا پھر جھک جانا پھر سجدہ میں گر پڑنا اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے۔ تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرط بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصہ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصہ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے۔

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ (علق۔رکوع ۱)

اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

گو سجدہ قربت الٰہی کی اخیر منزل ہے شاید اسی لئے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے:

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے۔ دعا اور استغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے۔ رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے۔ اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود و تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأت، قرآن، ذکر الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہیں ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کی ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے جو چاہے سجدہ کر لے جو چاہے صرف قیام کر لے جو چاہے زبان ہی سے

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود۔

ذکر وقرأت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انکاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی۔سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی۔نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی [1] اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواتر عمل کے ساتھ جن میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا:

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں۔خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کو نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے،جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں وہ سورۃ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے اسی لئے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے۔یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ﴾ (فاتحہ۔ا)

حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے رحم والا ہے مہربان ہے' ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں' تو ہم کو سیدھا راستہ پر چلا ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا' ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے [2] یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے۔خدا کی حمد وستائش ہے۔توحید ہے۔اعمال کی جزا وسزا کا یقین ہے۔عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے۔توفیق و ہدایت کی طلب ہے۔اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں سب سامنے آ جاتی ہیں۔جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی

ا۔ مؤطا امام مالک وصحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

۲۔ جامع ترمذی قرأت فاتحہ۔

وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان' چرند ہوں کہ پرند' پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب' مخدوم ہوں یا خادم' بادشاہ ہوں یا گدا' کالے ہوں یا گورے' عرب ہوں یا عجم' کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمان ورحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت' بے پایاں شفقت' غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے۔ روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ''ہم تجھی کو پوجتے ہیں'' کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں' ''ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ (راہ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں۔

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ لَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ o وَلَاتَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْكَانَ ذَا قُرْبٰى ج وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ o وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ﴾ (انعام۔ رکوع ۱۹)

کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو مت مارو لیکن انصاف کے ساتھ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے۔ شاید کہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ لیکن اچھی نیت سے، یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔ جب تم بات بولو تو انصاف کی گو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں صراط مستقیم کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا' ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک' اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا' معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری' بلا رورعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراط مستقیم کی مختصری ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفات حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص

بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ (نساء)

اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ۔ ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علی قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و کرام چھین لیا جاتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں۔ دوسری کا نمونہ یہود ہیں جنہوں نے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورہ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے۔ اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا۔

''جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ آدھی میرے لئے ہے اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب ﴿الحمد للّٰہ رب العٰلمین﴾ (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری ستائش کی، پھر جب وہ ﴿الرحمان الرحیم﴾ (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ پھر وہ کہتا ہے ﴿مالك یوم الدین﴾ (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی۔ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ ایاك نعبد و ایاك نستعین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا۔[1]

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی وینسنک (A.G.Wensinck) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پُر معلومات مضمون لکھا ہے

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۴۶، مصر۔

تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے۔

''(اسلام کی رو سے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے۔ ایک دفعہ محمد نے ایک پر نقش ونگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس میں دلی خضوع وخشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں خوشبو، اور عورت، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ محمد پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے۔ نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ ''نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے'' اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورہ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ [1]

اس دعائے محمد ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیاءؑ کی منصوص دعاؤں سے:

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو۔ کوہ طور پر جلوہ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے۔ زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے۔ مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ''داؤد کی نماز'' انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزء ہے۔ ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت حسن تعبیر جامعیت پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا تھا کہ نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔ [2] اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا:

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی:

''خداوند' خداوند' خدا' رحیم اور مہربان' قہر میں دھیما اور رب الفیض ووفا' ہزار پشتوں کے لئے فضل رکھنے والا' گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا' لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا''۔ (۳۴۔۶)

---

[1] یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے۔

[2] جامع ترمذی فضائل سورہ فاتحہ۔

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت موثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے۔ پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں باب اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعاء:-

زبور باب ۸۶

داؤدؑ کی نماز

''اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں وافر ہے۔

اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صفتیں کہیں نہیں۔ اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو یک طرفہ کرتا کہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔

اے خدا مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے، اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے، اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں کیوں کہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔''

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے لیکن طول تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا:

حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین

پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیوں کہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔ آمین''

نام کی تقدیس'' خدا کی حمد'' ہے بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے جو دعائے قرآنی میں ﴿مَـــالِكِ يَـــوْمِ الــدِّيْـنِ﴾ کے لفظ سے ادا ہوا ہے۔ نیز استعارہ کی زبان میں روز کی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لی جائے اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جا سکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبان نبوت سے ادا ہوئیں کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ دعائے محمدی تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے وہ مختصر ہے تاثیر سے لبریز ہے خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہوں۔ نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے۔ خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہوسکتا (یعنی ربوبیت' رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے، درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں، اوصاف الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز اً کیا گیا ہے۔ خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے۔ یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے' خدا کے عظمت وجلال، رحم و کرم' قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع وخضوع' بلند حوصلگی' صداقت طلبی کا ایسا جامع' مختصر اور پر اثر بیان سورہ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کے لئے تعیینِ اوقات کی ضرورت:

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے' ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں' اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کامل کو لے کر مبعوث

ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلا ناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لئے ہر منظم با قاعدہ اور دائمی عمل کیلئے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے با قاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کیلئے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے ہیں۔

اوقات نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیتوں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرہ ہوا میں لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے اور جہاں تک مطلع ومغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں میں طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں:

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو ''تِفِلاَ'' کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے۔

> ''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا...... پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے'' (۶۔۱۰ تا ۱۴)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے۔

''پر میں خدا کو پکاروں گا' تب خدا مجھے بچالے گا' شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا سو وہ میری آواز سن لے گا۔'' (۵۵۔۱۶۔۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر' ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی' لوقا کی انجیل میں ہے۔

''پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ انکو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا' ضرور ہے ایک تمثیل کہی'' (۱۸۔۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے' ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی' چنانچہ اعمال میں ہے۔

''پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا نگنے گیا۔'' (اعمال ۱۰۔۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے' ایک جگہ ہے۔

''پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے'' (اعمال ۳۔۱)

یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے ''نویں گھڑی کو'' لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں' پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰۔۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی' آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا' جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا' جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا' اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو......اس نے ان سے کہا تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آ کر کہے اے دوست مجھے تین روٹی ادھار دے''۔ (لوقا۔۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے (لوقا۔۲۲۔۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے۔ مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے ''اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی''[1] بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے[2] یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواماً اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے' چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وفی الصبح باکرا قام و خرج الی موضع خلاء و کان یصلی ھُنَاکَ یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء

[2] مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶۔۱۷) میں، صبح کا مرقس (۱۔۳۵) میں، عصر کا اعمال (۳۔۱، ۱۰، ۳۔۳۰) میں ہے اور عشاء (رات کی نماز) کا لوقا (۱۱، ۲۲، ۳۹) میں۔

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات:

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر کر دیئے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر ستاتا ہے پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو پھر سوتے وقت جب انسان اپنی یا احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیئے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشاء سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزوں ہے ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انہیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنج گانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ:

اوقاتِ نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب

کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ آفتاب ہے۔ ہندوستان' ایران' بابل' عرب' مصر' شام' روم' یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی جس کی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی' آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات تھے' جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کرکے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے' پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقاب شب میں اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی گل کیا[1] حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے ملت ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے' جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے' دین محمدی' ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے' اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملت ابراہیمی میں تھے' دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردہ عدم میں روپوش ہوتا ہے' دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے' اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (سمت الراس) سے نیچے اُترتا ہے جس کو زوال کہتے ہیں' جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں' آفتاب کے ان تینوں اوقاتِ انحطاط میں ایک نماز اور ہوتی ہے' خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ ط وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾ (بنی اسرائیل۔۹)

نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت' رات کی تاریکی تک (ظہر' عصر' مغرب' عشاء) اور فجر کی نماز۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط' تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں' نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت' اس کے عروج وکمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔[2]

اسلام میں طریق واوقاتِ نماز:

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں ادا کرے اور کتنی کتنی رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئے اور اس کے کیا اداب و

[1] قرآن پاک سورہ انعام،۱۹۔

[2] صحیح مسلم کتاب الصلوۃ الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیہا۔

شرائط ہیں، ان سب کے لئے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے۔

﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔رکوع ۳۱)

نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اللہ کے لئے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر دشمنوں کا خوف ہو یا تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن پاک کی اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریراً اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی و نگرانی:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں اور ان پر مداومت کریں قرآن پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ ''محافظت'' کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا:

﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ ﴾ (بقرہ۔۳۱)

نمازوں کی نگرانی رکھو۔

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (مؤمنین۔۱)

اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔

﴿ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (انعام۔رکوع ۱۱)

اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا۔

﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو

ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں:

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا ﴾ (نساء ۱۵)

بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟

ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کیے ہیں، صلوٰۃ، یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامت صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح وتحمید اور یاد الٰہی کے لئے بولا جاتا ہے جس کا جزو اعظم تسبیح وتحمید ہے۔ احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں۔[1] اور اشعار عرب[2] و لغت عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہئے۔

۱۔ ﴿ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِّصْفَہٗ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴾ (مزمل ۔۱)

رات کو کھڑا رہا کر مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

۲۔ ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ ﴾ (المؤمن ۔۲)

اور اپنے رب کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔

۳۔ ﴿ وَسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ﴾ (احزاب ۔۶)

اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔

۴۔ ﴿ وَتُسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ﴾ (فتح ۔۱)

اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

۵۔ ﴿ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ ﴾ (اعراف ۔۲۴)

۱۔ صحیح مسلم باب الضحیٰ ما رایت رسول اللہ ﷺ یصلی سبحۃ الضحیٰ قط وانی لا سبحھا نیز صحیح مسلم باب جواز النا فلۃ علی الدابۃ وباب وکنت اسبح فقام ان اقصی فقام سبحی۔

۲۔ اعشیٰ کا شعر ہے و سبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمد اء شعر الجاہلیۃ ج ۳ ص ۲۶۵۔

۳۔ لسان العرب ج ۳ ص ۳۰۱ مصر۔

اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں، صبح کو اور دوپہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔

۶۔ ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (انعام۔۶)

اے رسول! ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔

۷۔ ﴿ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ ﴾ (نور۔۵)

ان گھروں میں جن کو بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار اللہ سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

۸۔ ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (کہف۔۴)

اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔

۹۔ ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ (طور۔۲)

اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

۱۰۔ ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ (ہود۔۱)

اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔

۱۱۔ ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ (بنی اسرائیل۔۹)

نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا بیشک فجر کا پڑھنا پُر حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)۔

۱۲۔ ﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴾ (دہر۔۲)

اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔

۱۳۔ ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴾ (طہٰ۔۸)

کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔

۱۴۔ ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ (روم۔۲)

تو خدا کی تسبیح پڑھو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد، آسمانوں اور زمین میں اور دوپہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔

۱۵۔ ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝

وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ (ق۔۳)
تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔

۱۶۔ ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾ (نور۔۸)
فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے' ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسل ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام' فجر' ظہر' عصر' مغرب' عشاء ہیں' غدو' غداۃ' بکرۃ' فجر قبل طلوع شمس اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل' عشی' اور قبل غروب شمس سے مراد عصر لدلوك الشمس (زوال) اور حین تظهرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر' طرف النهار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من انائ اليل (کچھ رات گذرے) غسق اليل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوۃ العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے' اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل:

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت' مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے۔ سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں ہیں۔

﴿ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا o نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا o اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا o اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا o اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا o اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ﴾ (مزمل۔۱)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جاسکتی تھی، کیونکہ جہاں

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ (شعرا۔۱۱)

اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہوشیار کرو۔

کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے۔

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ o الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ o وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ o اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے۔ جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پر خطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ ﷺ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کو طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی۔

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴾ (طور۔۲)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی [1] اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی سورہ میں اس آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے۔ سورہ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے۔

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ﴾ (دہر۔۲)

تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ''ہنوز اصیل''[2] میں ظہر وعصر اور من اللیل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی کیوں کہ کل تین نمازیں تھیں ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح وتحمید با قاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں، حکم ہوتا ہے۔

﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ [3] النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ﴾ (ہود۔۱۰)

دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔

یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے با قاعدہ صلوٰۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے اس

---

1. صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن مطعمؓ

2. اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں' لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں' جو عصر کے لئے سورہ روم میں استعمال ہوا ہے۔

3. طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا' بالعشی والابکار بالغدو والآصال اس میں پہلا طرف فجر' بکرۃ اور غدو ہے دوسرا طرف عصر' عشی اور اصیل ہے۔

وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا﴾ (ھود۔۱۰)

پس تو سیدھا چلا چل جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں۔ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی، جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا اور تیسری سے عشا کی نماز مراد ہے۔ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا دوسری میں ظہر وعصر، اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں۔سورہ ق میں جو مکی سورہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾

پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر۔اور کچھ رات گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے)[1] سجدہ کرنے کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر۔

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا وتحقیر کے درپے تھے۔اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی۔ایک کی نسبت کہا گیا ومن الیل (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا ''وادبار السجود'' (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتہً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے ہنوز تفصیل طلب ہے جس کے اندر ظہر وعصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔چنانچہ سورہ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی تفصیل کی

---

[1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے اس لئے ادبار السجود سے ادبار سجود الشمس مراد ہے۔جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے۔آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے۔جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے۔چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا۔اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے۔چنانچہ اس معنی کے لئے سجود کا لفظ استعارةً لایا گیا سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے۔اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیروں میں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

گئی ہے۔اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

﴿ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ (روم۔۲)

اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یارات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور دہر، ہود، ق، روم اور نور میں۔ظہر کا بالاجمال دہر، ق، طٰہٰ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق اور روم میں، مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق میں، عشاء کا بصورت صلوٰۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء بالاجمال طٰہٰ، ہود اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے۔تمام نمازوں کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طٰہٰ میں ہے، طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین:

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ ''قبل الغروب'' یا ''اصیل'' یا '' طرف النہار '' کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے آخر آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر وعصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔یعنی مغرب وعشا دونوں کو ''حین تمسون'' (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں [1] اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے اس

[1] موطا امام مالک، مسلم ترمذی باب القصر فی الصلوۃ فی السفر والحضر، بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں۔(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں فاضل وینسک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے) دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے۔رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔فقہاء میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

اوقات پنج گانہ اور آیت اسراء:

محدثین اور مؤرخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنج گانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے۔ جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ گواوقات پنج گانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن اقامت صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) میں نماز پنج گانہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنج گانہ کی تکمیل بصورت صلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورہ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنج گانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴾

(اسرائیل۔۹)

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر بے شک فجر کی قرأت میں حضور ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنج گانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے دلوک کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دلوک الشمس یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی ہے اس طرح ''دلوک'' کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل (رات کی تاریکی) ہے یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ادا کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لئے ہے۔ بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقۃً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

ہونا چاہئے جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو بر تو حجابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے،اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں تبری ظاہر کرے،غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنج گانہ کا ثبوت ملتا ہے اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے۔اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنج گانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق:

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے۔چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

﴿ ودلكت الشمس تدلك دلوكا غربت وقيل اصفرت و مالت للغروب و فى التنزيل العزيز اقم الصلوة لدلوك الشمس الى غسق اليل و قد دلكت زالت عن كبدالسماء .... و قال الفراء عن ابن عباس فى دلوك الشمس انه زوالها الظهر قال ورأيت العرب يذهبون بالدلوك الى غياب الشمس۔

قال الشاعر:

هذا مقام قدمى رباح ذبب حتى دلكت براح

يعنى الشمس۔ قال ابومنصور وقد روينا عن ابن مسعود انه قال دلوك الشمس غروبها وروى ابن هانى عن الاخفش انه قال دلوك الشمس من زوالها الى غروبها و قال الزجاج دلوك الشمس زوالهافى وقت الظهر وذالك ميلها للغروب وهو دلوكها ايضا يقال دلكت براح و براح اى قدمالت للزوال حتى كادالناظر يحتاج اذاتبصرها ان يكسر الشعاع عن بصره براحته، فان قيل مامعنى الدلوك فى كلام العرب قيل الدلوك الزوال و لذالك قيل للشمس اذازالت نصف النهار دالكة و قيل لها اذا افلت دالكة لانها فى الحالتين زائلة ..... قال الفراء فى قوله براح جمع راحته و هى الكف يقول يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد ﴾

آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کے لئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا.... اور فراء نے کہا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی ظہر کے وقت

آفتاب کے زوال کے ہیں اوراس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کودلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے شاعر کہتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا' ابومنصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ دلوک شمس کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براح وبراج یعنی آفتاب زوال کے لئے جھک گیا یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو اس کرن کی شدت کو توڑنے کے لئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے ..... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لئے آفتاب کو دالکۃ کہتے ہیں جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو دالکۃ کہتے ہیں کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج [1] کہتا ہے۔

﴿ والشمس قد كادت تكون دلفاً   ادفعها بالراح كي تزحلفا﴾

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہوکر دبلا ہوجائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے۔

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کے آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اوراس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہوکر ڈوب جاتا ہے ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جوزوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾

آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔

---

[1] یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں اور لسان العرب میں ونف اور زحلف کے تحت میں مذکور ہے۔

سے مراد تین نمازیں ہیں کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے [۱] اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں اس طرح اس آیت سے جو سورہ اسراء میں واقع ہے اوقات پنج گانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز:

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنج گانہ کی تعلیم کا ذکر [۲] ہے اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا' ظہر کے بعد عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشاء، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں اس کے بعد صبح کی نماز ہے جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اس قدر فصل ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے پھر خاموشی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقات پنج گانہ کی ایک اور آیت:

سورہ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنج گانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ (طٰہٰ۔۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے' ڈوبنے سے پہلے عصر ہے' رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے، اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

---

۱ تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس زوال آفتاب مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر، اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء، اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنج گانہ کو بتاتی ہے۔

۲ سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ۔

اطراف النہار کی تحقیق:

یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح دوپہر اور شام۔ پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آ جاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین، دو مشرق اور دو مغرب ہے۔ دوسری جگہ انہیں کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے سورہ تحریم میں ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں گے قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہو سکتا مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے۔ اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں۔ یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔ صبح سے مراد دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبها کے اندر مستقل موجود ہے اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقہ ثبوت:

اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنج گانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مثلاً

۱۔ ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾ (اسراء۔۹)

زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔

یہ ظہر کی نماز ہے۔

۲۔ ﴿ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ (ق۔۳)

اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔

﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ (دہر۔۲)

اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر [1] کو۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو۔

﴿ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ (بقرہ۔۳۱)

بیچ کی نماز۔

---

[1] الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری ولسان العرب)

سورۂ بقرہ میں اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ (ھود۔۱۰)

اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورہ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾ (نور۔۸)

صبح کی نماز سے پہلے۔

اس سے نماز صبح کا عملی ثبوت بھی ملا پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

﴿ وَمِنْ ۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾

اور عشاء کی نماز کے بعد۔

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اُتار دینے کا وقت ہے کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں' یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقاتِ نماز ہیں۔

نماز پنج گانہ احادیث وسنت میں:

تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت ﷺ کو جو خاص تفوق وامتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیروؤں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہ کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان وآداب وشرائط واوقات وتعداد کی پوری تشریح فرما دی' اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہئے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہئے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی۔ صحابہؓ کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلانِ نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا یہ فرض ادا ہوتا تھا۔ آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروان محمدی جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشہاد سفر وحضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ کیا ایسی مستمر علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہوسکتا ہے یہ اہتمام یہ علانیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروؤں

کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہو گیا، خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعتِ آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے کیوں کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آ کر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان وشرائط واحکام روایتاً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں۔ نماز وہ فریضہ الٰہی ہے جس کی فرضیت خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے، حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں [۱] جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (انعام۔۲۰) یعنی جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتہ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریقِ ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی [۲] اور وہی آپ نے اپنے پیرووں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جونجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، کیا یہ سچ ہے۔ فرمایا، ہاں سچ ہے۔ عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ [۳]

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے [۴] ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہے گا، فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے [۵] اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے۔ پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا

۱؎ بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ کتاب الصلوٰۃ وکتاب الاسراء۔
۲؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوٰت الخمس۔
۳؎ صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ص ۱۱۔ وصحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص ۲۴ و ۲۵ مصر۔
۴؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم و مؤطا باب اوقات الصلوٰۃ الخمس۔
۵؎ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰت الخمس کفارہ۔

وقت ہے۔ [1]

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضورؐ صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرأت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے [2] حضرت جابرؓ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ [3] صحابہ کہتے ہیں کہ حضورؐ ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی۔ مغرب میں سورہ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی، عشاء میں اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرأت کی ہے اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے۔ [4]

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے اس وقت سے آج تک تمام امتیان محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے۔ [5]

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟

ان نماز پنج گانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی عام امت کے لئے نفل ہوگئی چنانچہ پوری آیت یہ ہے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ (اسراء۔۹)

نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قرأت قائم کر، بے شک صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ وہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوٰت الخمس۔

[2] صحیح بخاری باب وقت الظہر عندالزوال۔

[3] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذاجتمع الناس او تأخروا۔

[4] ایضاً باب القراۃ فی الظہر و العصر و المغرب و العشاء و الفجر بروایات متعددہ۔

[5] چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تا کہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

کہ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو۔[۱] اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنج گانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے کیوں کہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ:

انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا۔ اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے، کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔[۲] آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں' آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں، اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں۔ اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ ایلیسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا۔ شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے[۳] بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل"[۴] بنا لیتے تھے قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں۔

﴿وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (یونس۔۹)

اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو اور نماز کھڑی کرو۔

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے۔

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا" (۵۔۷)

---

۱ صحیح مسلم جلد اول باب وجوب قراۃ الفاتحہ حدیث ارجع فصل فانک لم تصل نیز دیکھو فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۳۔

۲ الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ۔

۳ یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ قبلہ میں ہیں۔

۴ سفر تکوین باب ۱۲۔۸ و ۱۳۔۴ و ۲۸۔۱۷، ۱۸۔۱۹ و ۳۱۔۱۳۔

سلاطین اوّل میں ہے۔

''جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے' اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا'' (۷۔۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے۔

اور اس زمین کی طرف جس کو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگیں'' (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے۔

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾

اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے جدھر وہ منہ پھیرتی ہے' تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے' ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر' پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے' مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو' عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اسی قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں' مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی' اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے جنھوں نے اس کو قبلہ بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے' خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی' کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا' تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی' آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے' کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا' لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ (بقرہ۔۱۴)

اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھم' تو جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے' بیشک اللہ بڑی گنجائش' اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے' یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی

ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے۔

﴿ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ط قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (بقرہ۔۱۷)

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا' جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر' مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا' ان کو خطاب کر کے فرمایا۔

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا' قیامت، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں' یتیموں، غریبوں' مسافروں سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں' یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیزگار ہیں۔

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے' قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں ہے لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اسی لئے ۲ھ میں خانہ کعبہ بنانے کا حکم ہوا۔

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ﴾ (بقرہ۔۱۷)

پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا' جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے اس طرح مشرق' مغرب' جنوب' شمال' سب بہ یک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہیں جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہً خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔

(۱)۔ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے' ایسی چیز یا تو

کوئی مصنوعی شے ہوسکتی تھی مثلاً چراغ، کوئی موی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء وعناصر وکواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہوجاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا اور دوسری چہرہ خورشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیباچہ تھی۔ دین توحید کیلئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

(۲) یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہوسکتا ہے ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی۔ اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع وغروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے متعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

(۳) اسی لئے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

(۴) اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا ﴾ (آل عمران۔۱۰)

بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لئے (خدا کا) بنا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔

﴿ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے۔

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا چنانچہ قرآن پاک میں ہے

﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ﴾ (بقرہ۔۱۷)

اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے۔

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے پر وہ جو

لونڈی سے تھا (اسماعیلؑ) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد تھا (اسحٰقؑ) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں اس لئے کہ یہ عورتیں وہ عہد ہیں ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہیں یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلتیوں کے نام ۲۲-۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں ''اب کے یروشلم'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کیے تھے ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا' اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا' اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے۔ یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی گویا حضور انور ﷺ کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد' سرکشی' اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت ﷺ کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا' گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بسلسلہ معراج

﴿ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ ﴾ (بنی اسرائیل-۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیل کا نشان تھا' اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیل سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے۔

﴿ وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ

اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے والوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر خطیرۃ القدس کا عکس تھا' اس لئے حکم ہوا۔

﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ (بقرہ۔۱۸)

اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے' اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا۔

﴿ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۴)

پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں' نہ مشرکوں' بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے، اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے' خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا' اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے۔ اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو، ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے' سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں۔ گھمسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت' دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار' محمد رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدیت کا شیرازہ ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے

ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے وہ مسلمان [1] ہے اگر خیال کے پر پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد:

ایک قیام' اس کے بعد رکوع' پھر سجدہ' اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے' نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں' صبح کو دو' ظہر' عصر اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین' ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ کر سکے' نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنا دے' ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ صرف چند سیکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے اس لحاظ سے اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی۔ جب مدینہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر' عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں کر دی گئیں لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتیں [2] قائم رہیں کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے جو اس تخفیف کی علت تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں' مسافر کے لیے دو اور بحالت خوف ایک۔ [3] اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بناء پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا اور صبح میں کچھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے ''مغرب میں تین اس لئے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لیے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دی گئی ہے'' [4]

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گذر چکا ہے عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا [5] مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لئے اس

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلۃ۔
[2] صحیح بخاری باب الہجر ۃ وصحیح مسلم صلوٰۃ المسافر و مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان والبیہقی (فتح الباری ج ۱ ص ۳۹۳)۔
[3] صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر۔
[4] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۱۔
[5] صحیح مسلم النهی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث۔

وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔[1] یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا' دو کا عدد بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے طاق نہیں بنابریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں نیز نماز کے خشوع و خضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا ہے اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں اسی وقت ہوتا ہے اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے' اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿او تروا یا اهل القرآن فان اللّٰه وتر یحبّ الوتر﴾ (ابوداؤد)

اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو' کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام و سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزوں ہوتی ہے' دل مطمئن ہوتا ہے' تمام عالم اس وقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزوں ہے' اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (بنی اسرائیل)

صبح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں' مگر حکم دیا گیا کہ قراءت لمبی کر دی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے[2] اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا۔[3]

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہیں تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں' پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے پھر اگلا حصہ امام کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک' اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے' تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں' جب نمازِ خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی' اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے' نمازِ قصر کی آیات سورہ نساء کے پندرھویں رکوع میں ہیں۔

---

[1] عشاء کے بعد وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی جورات کی نماز ہے۔

[2] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراۃ۔

[3] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ و تخفیفها فی تمام۔

نماز کے آداب باطنی:

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں۔مثلاً صلوۃ،دعا،تسبیح اور ذکر الٰہی اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب ظاہر کرتے ہیں۔نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گل بے رنگ اور شراب بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامت صلوٰۃ:

نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جا بجا اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے۔﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے اس بناء پر نماز میں اطمینان ارکان کا اعتدال باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت:

نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے،لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں چپ رہنا،بندگی کرنا،دعا مانگنا،عبادت کرنا،کھڑے رہنا،دیر تک کھڑے رہنا،عاجزی کرنا،نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے کیوں کہ نماز میں ذکر و قرأت تسبیح و استغفار سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے وہ خدا کی بندگی بھی ہے،دعاء بھی ہے،عبادت بھی ہے،اس میں دیر تک قیام بھی ہے،اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اس قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع: تیسری چیز خشوع ہے چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں۔

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہوتو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

تبتل:

تبتل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورہ مزمل میں ہے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴾ (مزمل۔۱)

اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم وبیش، اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے، تیرے لئے دن کو بڑی فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کرلیا (وفرّغ قلبہ، للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت [1] پیدا کیا ہو۔ یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرّع:

تضرّع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ (اعراف۔۷)

تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔

---

[1] صحیح مسلم جلد اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا۔

اخلاص:

نماز کے باطنی سنن وآداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریاء اور نمائش ہوگی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا، فرمایا

﴿ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (اعراف۔۳)

اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ذکر:

نماز خدا کی یاد کے لئے ہے اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی اس لئے فرمایا:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾ (طہ۔۱)

میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم وتدبر

نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نساء۔۷)

نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے؛ اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو [1] دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے" [2] حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے یہاں تک کہ نماز ختم کرلے تو وہ ایسا ہو

---

[1] مسلم کتاب الصلوۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد ا صفحہ ۲۹۳۔

[2] بخاری وابوداؤد ومسند احمد عن انس۔

جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ [۱]

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴾ (ماعون۔۱)

پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب مثلاً وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرع وزاری اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہیں ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آ کر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپ نے فرمایا اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔ [۲]

نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔ [۳] آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔ [۴] طبرانی میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو [۵] مسند بزار میں ہے کہ جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر

---

۱ مستدرک (ترغیب وترہیب حافظ منذری جلد اول صفحہ ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے ورنہ چاہئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نشین کر لیں اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

۲ صحیح بخاری، صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ۔

۳ مسند احمد عن جابر بن سمرہؓ۔

۴ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوٰۃ۔

۵ طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرہؓ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔

کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔[1]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا۔[2] ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے۔[3] صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا۔ کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے۔[4] نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔[5] دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔[6] مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔[7]

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں۔ ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو اور تم باہر سے آؤ تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو[8] اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے۔ مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تا کہ نماز اطمینان سے ادا ہو۔[9] اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے تب نماز پڑھی جائے۔[10]

---

۱ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔

۲ مسند احمد عن قتادہ و داری باب من لایتم الرکوع والسجود، و ابن ابی شیبہ، و ابن خزیمہ، و ابن حبان، و عبد ابن حمید، و عبد الرزاق، و طبرانی فی الاوسط اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔

۳ مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۳۶ (علی شرط مسلم)۔

۴ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ۔

۵ صحیح مسلم کتاب المساجد باب النهی عن البصاق فیہا و حاکم فی المستدرک و ابوداؤد۔

۶ صحیح بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد۔

۷ ایضاً باب النهی عن البصاق فیہا۔

۸ صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوٰۃ بوقار۔

۹ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی باب کراهة الصلوٰۃ بحضرة الطعام۔

۱۰ صحیح مسلم و ابوداؤد و موطائے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ۔

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔لیکن مدینہ آ کر یہ اجازت منسوخ ہوگئی ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی آنحضرت ﷺ کو کوئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا فرمایا۔ [1]

﴿ان فی الصلوٰۃ شغلاً﴾

نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے۔ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی پھر فرمایا اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ۔ [2] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی آپ نے اس کو اتروا دیا۔ [3]

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے اس لئے توقف کا حکم دیا گیا۔گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

﴿فان الصلوۃ مشھودۃ محضورۃ﴾ [4]

کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔ [5] کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ایک صحابی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے یا ہانڈی

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ ۔

[2] صحیح مسلم باب کراھۃ الصلوٰۃ فی ثوب لھا اعلام۔

[3] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس۔

[4] صحیح مسلم باب النھی عن الاوقات الثلث۔

[5] صحیح بخاری کتاب الایمان۔

ابل رہی ہے۔ [۱]

رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔قرآن پڑھتے چلے جاتے۔ جب خدا کی عظمت وکبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ [۲] آپ نے فرمایا کہ نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے خشوع اور خضوع ہے عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔ [۳]

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا لوگو تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔ [۴]

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ ہدایت فرمایئے۔ ارشاد ہوا کہ ''جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اس وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو'' [۵] تمہاری نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہے؟ اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (انعام۔۱۱)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے:

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق وتمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے

۱ ترمذی وابوداؤد و باب، البکاء فی الصلوۃ۔

۲ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳۔

۳ ابوداؤد باب صلوۃ النہار و ترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوۃ صفحہ ۱۷ مطبوعہ دہلی۔

۴ ابوداؤد و صلوۃ اللیل۔

۵ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب۔

بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے۔

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں، اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی۔

﴿ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (اعراف۔۳)

ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک، اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا، وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ اس کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈال لینے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقراء کے بعد دوسری ہی وحی میں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا۔

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (مدثر۔۱)

اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی،

یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا' صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے' آپ نے ان کو روکا' اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے' اس قسم کی نجاستوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہے" اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہادو' ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا" غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی' اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا' اور استنجاء' بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں۔

نجاستوں سے اپنے بدن' کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی' جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے' خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿ فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ (توبہ۔۱۳)

اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک و صاف رہیں' اور اللہ تعالیٰ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

۳۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے' دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں' ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے' ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے' ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو' حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں' نمازیوں کو پنج وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں' جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں' آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا"۔

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے' ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے' وہ محنت مزدوری کرتے تھے' جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے' اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے' اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے' تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی' اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز

سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم ﴾ (بخاری کتاب الجمعہ)

جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا۔

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ﴾ (مائدہ۔۲)

اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

۴۔ پابندی وقت:

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے، اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں، اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے۔

﴿ الصلوة مكيال فمن اوفى اوفى به و من طفف فقد علمتم ما للمطففين ﴾[1]

نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس کو پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا، اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

۵۔ صبح خیزی:

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں

---

[1] کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ جلد چہارم صفحہ ۲۳۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔

کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے [۱] تا کہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پر تاثیر آواز

﴿ الصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ﴾

سونے سے نماز بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھاوے۔

۶۔ اللہ کا خوف:

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ (عنکبوت۔۵)

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

۷۔ ہشیاری:

نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیات الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح وتہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم اور احساس کو کھودیں نماز کی حقیقت کے منافی ہیں، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا۔

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نساء۔۷)

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بناء پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں قطعاً پرہیز کرے گا۔

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان:

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جز تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے، اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی

[۱] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب مایکرہ من السمر بعد العشاء۔

گراں نہیں ہوسکتی تھی' فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے' صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی' روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہوسکتا ہے' صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہوسکتی ہے' چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا۔

﴿ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ﴾ (نساء۔۲۱)

اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

نیز فرمایا۔

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۵)

خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں' آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ ليس صلاة اثقل على المنافقين من الفجر و العشاء ﴾ [1]

منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ''جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔'' [2]

مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی' وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے' مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے' بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے' مدینہ میں یہود آباد تھے' جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے' وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے' اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے' اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ قبلہ بنانے سے ہوسکتی تھی' چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ﴾ (بقرہ۔۱۷)

اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں' ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے' اور یہ قبلہ گراں ہوا لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی' اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' وہ مسلمان ہے۔ [3]

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے' اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل صلاۃ العشاء فی الجماعۃ۔

[2] مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول صفحہ ۲۱۱۔

[3] بخاری باب فضل استقبال القبلہ۔

تیار رہنا چاہئے‘ اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں‘ چنانچہ ابوداؤد میں ہے۔

﴿ کان النبی ﷺ و جیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا و اذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علی ذلک ﴾ (ابوداؤد)

آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا‘ نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی‘ ایک افسر (امام) کی اطاعت‘ تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری‘ اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے‘ اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے‘ جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا‘ ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا عصر کے وقت لہوولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا‘ رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا‘ صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا‘ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں‘ اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے لئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں‘ ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا‘ دن رات کے پرآرام سے پرآرام وقت میں ممکن تھا‘ مگر اس کے لئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں‘ اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لئے کس قدر ممد ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ تمام عبادات‘ بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے‘ لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے‘ تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں‘ اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے‘ زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے‘ حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے‘ اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے‘ برخلاف ان کے نمازوں میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے‘ ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے‘ سجدہ‘ رکوع‘ قیام و قعود‘ جہر‘ خفاء‘ تسبیح و تہلیل‘ تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے‘ جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے‘ اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے‘ اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

۱۱۔ الفت و محبت:

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے‘ محلّہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی‘ ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی‘ اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے‘ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

﴿ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ﴾ (روم۔۴)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۱۲۔ غمخواری:

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ ہوں گے اور امراء اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہو گی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہو گی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہو گی۔

ابتدائے اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

﴿ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱)

اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

۱۳۔ اجتماعیت:

اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہیں، جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرنسوں، اینیورسریوں اور دوسرے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے، اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کی بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے، چنانچہ

اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیادی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۴۔ کاموں کا تنوع:

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے، جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیات الٰہی میں شمار کیا گیا ہے، کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لحہ اور لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جا کر منتہی ہوئی، اب نیند آ گئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے، وہ اس روحانی ''انٹرول'' (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کر لی۔

۱۵۔ تربیت:

انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں فرمایا۔

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ احب العمل الی اللّٰہ ادومه و ان قلّ ﴾ (ابوداؤد باب مایومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ)

محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶۔ نظم جماعت:

کسی قوم کی زندگی اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ''جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔''[1]

۱۷۔ مساوات:

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لئے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف ورذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

۱۸۔ اطاعت:

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعہ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کی اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لئے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لئے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ و بعدھا و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف۔

نماز میں ہوتی ہے' دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے' نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے' وہ ایک دائمی حرکت ہے' جو قوم کے اعضاء وجوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کے لئے تیار رکھتی ہے' اس کے ساتھ نماز پنج گانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے' اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب' اس پر نکتہ چینی' اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے' نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں' ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت میں مصروف ہو' نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا' ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا' چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا' اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں' احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' جس میں آئمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹۔ معیار فضیلت:

نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے' اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقراء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے' ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے' دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں انہیں قرآن زیادہ یاد ہے' چنانچہ آپ نے اسی کم سن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا' اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی وعملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق وترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰۔ روزانہ کی مجلس عمومی:

آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا' یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی' یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی' تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلٰوة جامعة (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے' اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے' یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے' یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی' اجتماعی' سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا' جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل وسستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی واجتماعی و تمدنی وسیاسی واخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے' اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا' اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم وجماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے' مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز' اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی' جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار وتعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے' اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے' ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا' ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر

نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارۃ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم وارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام وعیش اور فائدہ کو قربان کر دینا، اور اختلاف باہمی کو تہہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا، اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام وقائد وسرلشکر مان کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کا نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبرداری، اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں، اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد وامامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بناء پر داعی اسلامؐ نے یہ فرما دیا۔

﴿ العهد الذى بيننا وبينهم الصلوٰة فمن تركها فقد كفر ﴾ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اس کو چھوڑا، اس نے کفر کا کام کیا۔

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان، شراب بے نشہ اور گل بے رنگ وبو ہو کر رہ جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ:

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح وتحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا وہ جس کی روح ربانی تسکین وتسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی۔ اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں۔ اس کی روح یاد الٰہی کی تڑپ اور ذکر الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

دل را کہ مردہ بود حیاتے زنو رسید ۔۔۔ تا بوئے از نسیم میش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

﴿ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (نساء۔۲۱)

اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر وبرکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو

ذکر الٰہی سے غافل نہ کرسکیں۔

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ﴾ (نور۔۵)

ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید وفروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بے قراری تھی۔

﴿ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے۔

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوۡبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ﴾ (سجدہ۔۲)

جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

﴿ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ ارۡكَعُوۡا لَا يَرۡكَعُوۡنَ ﴾ (مرسلات۔۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ

﴿ تَرٰهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ﴾ (فتح۔۴)

تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ﴾ (زمر۔۵)

اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے مکدر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا۔

﴿ اَلَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ﴾ (انفال۔۱، ج۔۵)

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید وفروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی

---

[1] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البز مرسلاً۔

تکبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ [1]

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی۔

﴿ اِنَّ رَبَّکَ یَعۡلَمُ اَنَّکَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰی مِنۡ ثُلُثَیِ الَّیۡلِ وَ نِصۡفَہٗ وَ ثُلُثَہٗ وَ طَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ ﴾ (مزمل۔۲)

بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا۔ جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے۔

﴿ وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۙ الَّذِیۡ یَرٰىکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ۙ وَ تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔

مدینہ منورہ میں آ کر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا۔

﴿ یا ایھا الناس اطعمو الطعام و افشوا السلام و صلّوا بالیلِ و الناس نیامٌ ﴾ (ترمذی)

اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں۔

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ”عثمان تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی“ [2] حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ [3] حضرت ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ [4] حضرت عبداللہؓ بن عمرو ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ [5] حضرت ابو درداؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں

---

۱ فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۲۵۳ بحوالہ عبدالرزاق۔

۲ ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ۔

۳ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی ﷺ من اللیل۔

۴ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الخفف۔

۵ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

گذار دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ ان کے اسلامی بھائی تھے ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ جب رات کو حضرت ابودرداؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ [1] کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے۔ ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پرخطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا۔ جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔ [2] سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ [3] پھر وہ جس خضوع وخشوع محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پراثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا [4] حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی [5] حضرت تمیم داریؓ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی۔ بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ [6]

ع شب شود صبح و ہماں محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ [7] حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ [8]

ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا

---

۱ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۲ ابوداؤد باب صلوۃ الطالب۔

۳ نسائی کتاب الامامہ باب المحافظة على الصلوة۔

۴ صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوۃ۔

۵ صحیح بخاری کتاب الہجرۃ و کتاب الصلوۃ باب المسجد یکون فی الطریق۔

۶ اسد الغابہ تذکرہ حضرت تمیمؓ داری۔

۷ صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین۔

۸ حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ۔

کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے۔ نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں۔ ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا۔ جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں۔[1]

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں تیروں کا مینہ برس رہا ہے نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوندرہی ہیں، سر و گردن دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آجاتا ہے فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پرواہ ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظمؓ امامِ نماز ہے۔ پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں۔ پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔[2]

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لئے جگایا تو بولے ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا آپ نے نماز پڑھی۔[3]

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں[4] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان میں جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لئے ہوتے ہیں اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے۔ آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔[5]

نماز میں جس خضوع اور خشوع کا حکم ہے صحابہؓ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابوطلحہؓ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چہچہانا شروع کیا۔ حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم۔

[2] صحیح بخاری واقعہ شہادت عمرؓ۔

[3] موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم۔

[4] الریاض النضرہ للمحب الطبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۶ مصر۔

[5] تاریخ طبری کبیر ص ۳۴۷ ج ۷ واقعات ۶۱ ھ۔

خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی۔ جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دور تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں' چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا [1]

[1] یہ دونوں واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوۃ باب مایشغلك عنها میں مذکور ہیں۔

زکوٰۃ

﴿وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ﴾

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم:

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق ومخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں:

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

﴿ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ (بقرہ۔۱۰)

(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ۔

﴿ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ ﴾ (مائدہ۔۳)

(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر میں ہے۔

﴿ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ہ وَّ کَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا ﴾ (مریم۔۴)

اور قرآن میں اسمٰعیل کا ذکر کر' بے شک وہ عہد کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

حضرت عیسٰیؑ کہتے ہیں۔

﴿ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴾ (مریم۔۲)

اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷۔۳۰۔۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا۔ (خروج ۳۰۔۱۳۔۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی۔ یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔[۱] اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔[۲]

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا۔ انجیل لوقا (۱۸۔۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ویں باب کی پہلی آیت میں ہے۔

''اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے۔

''کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔'' (متی ۱۹۔۲۴)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۱۷۔۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے۔ سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے۔ اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

﴿ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ (بقرہ۔۱۰)

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برطانیہ کا طبع یازدہم مضمون ''خیرات'' (Charity) باب ''یہودیوں میں خیرات''۔

[۲] توراۃ خروج ۳۰۔۱۶ اور ۳۸۔۳۶۔

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا' دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل:

محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے سونا چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں۔ سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ متعین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں۔ پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت:

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے۔ ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ایتاء الزکوٰۃ آیا ہے۔ مثلاً

﴿ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (یا) اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾

اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ نبوی میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز پڑھنا' زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ وفد عبدالقیس نے ۵ ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو

جگہ دی۔ [۱]

۹ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا' جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے' جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ [۲]

صحابہؓ میں جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے خدا کی قسم! جو رسول اللہ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا [۳] حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ [۴] اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظام روحانی نماز با جماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو' قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو' مرتب ہوتا ہے اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

۱۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۸۸ میں ہیں۔

۲۔ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول' ص ۱۸۸۔

۴۔ درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ .. فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (توبہ-۱۰) ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ.. تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دے دو' نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ باب کراھیة الاختلاف۔

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری‘ مسکینوں کی دست گیری‘ مسافروں کی امداد‘ یتیموں کی خبر گیری‘ بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل:

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے پریشانی ہوئی ہے۔ حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا۔ اس کی مقدار‘ نصاب‘ سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خدا کا حق اور بھائیوں کا حق۔ پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی۔ آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں۔ قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کماتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں۔[1] غور کرو‘ کیا زکوٰۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بناء پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورۃ ہے لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا۔ اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (مدثر۔۱)

اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے۔ اس کے بعد ہے۔

﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾ (مدثر۔۱)

اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اوّل۔

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا وَّمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ھُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ﴾ (مزمل۔۲)

اورنماز کھڑی کرواورزکوٰۃ دواوراللہ کواچھا قرض دواور جوتم آگے بھیجو گے اپنے واسطے،اس کوخدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اورنجاشی نے اپنے دربار میں بلا کران سے اسلام کی حقیقت اوراس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اورحضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جوتقریر کی ہے اس میں ہے"اوروہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں،روزے رکھیں اورزکوٰۃ دیں"[۱] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جوتقریباً ۵ ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ [۲] ۶ ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جواس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا [۳] بھی تذکرہ کیا،ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸ ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ امت کوعملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھااس لئے حالات کے اقتضاءاورمناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاءاوران کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی شکستہ حالی اورغربت ومسکینی کی جوکیفیت تھی اس کی بنا پراتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم ومسکین اوربھوکے کوکھانا کھلادیں چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی۔

﴿ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَۃُ ۝ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَۃٍ ﴾ (بلد۔۱)

اورتو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے کسی (قرض دار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کوکھانا کھلانا۔

عام قریش پرجنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا' عتاب آیا۔

﴿ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴾ (ماعون۔۱)

وہی ہے جوبن باپ کے بچہ کودھکا دیتا ہےاورغریب کے کھلانے پراپنے کوآمادہ نہیں کرتا۔

﴿ کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴾ (فجر۔۱)

---

۱ مسند احمد جلد اول صفحہ ۲۰۲۔

۲ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

۳ صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ وکتاب التفسیر۔

یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔

اور مسلمانوں کے اخلاص باہمی ہمدردی اوران کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴾ (دھر۔۱)

اور وہ (حاجت مند ہونے کے باوجود) محتاج یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا[1] یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذاریں اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔ انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ہم کیا خیرات کریں۔

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ﴾ (بقرہ۔۲۷)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

ارشاد ہوا۔

﴿ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (بقرہ۔۲۷)

کہہ دو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کردیں آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں[2] کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ (بقرہ۔۱)

---

[1] تاریخ طبری طبع یورپ صفحہ ۱۲۸۱۔

[2] کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری جلد ۳، صفحہ ۲۱۶۔

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہؓ نے آ کر عرض کی، اے خدا کے رسول جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے۔ فرمایا، وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے۔ انہوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے۔ فرمایا، کہ وہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے یہی اس کا صدقہ ہے۔[1] آنحضرت ﷺ کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔[2]

لیکن بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا۔ رمضان ۸ ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (توبہ۔۱۳)

(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا۔[3] اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی یہ تمام احکام و قوانین سورہ براءت میں مذکور ہیں جو ۸ ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین:

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا۔ (استثنا ۱۴۔۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی۔ اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے۔ اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی کیوں کہ تمام متمدن دنیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

[2] ایضاً۔

[3] ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۷۲۲ مطبوعہ یورپ۔

نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اوراس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اوران کا بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں جاڑا' گرمی' برسات' ربیع اور خریف گذر جائیں تا کہ پورے سال کے آمدوخرچ اور نفع ونقصان کی میزان لگ سکے اور زمیندار' کاشتکار' تاجر' نوکر' صناع' ہرایک اپنی آمدنی وسرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے۔ بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے [۱] ان تمام وجوہات سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے۔ شریعت محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورہ توبہ میں موجود ہے جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے۔

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ (توبہ۔۵)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس دن اللہ نے آسمانوں کواور زمین کو پیدا کیا۔

زکوٰۃ کی مقدار:

توراۃؔ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیروغریب سب پر یکساں فرض تھا۔ لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے' نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں' بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہوسکتا۔ انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصادسیاسی (پولیٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہرایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا۔ اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم وبیش جو وہ چاہے خدا کی راہ میں دے دے اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔

﴿ اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ (معارج۔۱)

---

[۱] بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو'اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔

اس آیت سے صاف وصریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ﴿ مَعْلُوْمٌ اور مَعْلُوْمَاتٌ ﴾ کے الفاظ جہاں آئے ہیں وہاں یہی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے۔ یعنی پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں نصف مثقال۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا۔ یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔ اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے۔ اس لئے اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو رباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے۔ شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو۔ ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدِ نظر تھی اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا۔ اس طرح چوتھ کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنے ذاتی ضروریات اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے، خمس ہے، قرآن نے کہا۔

﴿ وَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (انفال۔۵)

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔

نکتہ:

اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔ اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور

آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔ اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آ جائے اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے تا کہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر رکاز یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آ جائے خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں تا کہ ان سے حسب منشاء خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشو ونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی[1] پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشو ونما پانے والی چیزیں چار ہیں۔ زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے مگر

---

[1] قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا حلیة تلبسونها (نحل وفاطر) زینت جن کو تم پہنتے ہو۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہا کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تجارت کے لئے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی لیکن دیانۃً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہگار ہوگا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تعیش اور فخر ومباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہوگی جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کر لے، اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریات زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ ٹوٹ جائیں یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے، اور وہ ضروریات زندگی کے لیے زر مبادلہ ہے۔ وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے اس لئے وہ معیار زر ہیں۔

موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے اس پر بلامحنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا۔ زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا تو اس میں قسم اوّل سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۱/۲۰) مقرر رہا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی حفاظت نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری گم شدگی لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۱/۴۰) حصہ مقرر رہا۔ [1] (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے صرف غذا ہے۔ زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی جاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپے دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں شہر شہر ملک ملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس انفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت و حکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہیں اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں اس بناء پر ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے۔ ان دوسو درموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا۔ یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۵ او ۱/۱۰ او ۱/۲۰ او ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

---

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں بیان کیا ہے۔

جانوروں پر زکوۃ:

توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوۃ کا تھا۔[1] لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہوسکتا اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی۔ شریعتِ محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوۃ سے مستثنیٰ کردیا۔ مثلاً خچر گھوڑے[2] پر کوئی زکوۃ نہیں دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی۔ یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں بلکہ فرامین کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری	"	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں	"	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دو سالہ بچہ
"	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	"	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ بچہ
"	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ	بکری	۴۰ سے ۱۲۰	ایک بکری
"	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے	"	۱۲۱ سے ۲۰۰	دو بکریاں
"	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے	"	۲۰۰ سے ۳۰۰	تین بکریاں
"	۱۲۰ کے بعد ہر ۴۰ پر	دو سال کا ایک بچہ	"	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ	گائے، بیل بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں	"	۳۰	ایک دو سالہ بچھڑا
			"	۴۰	تین سال کا ایک بچھڑا
			"	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے

[1] احبار ۲۷۔۳۲

[2] حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
			گائے،بیل،بھینس	۸۰	تین سال کے دو
			"	۹۰	تین سال کے تین
			"	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک
			"	پھر ہر دس پر	ایک دو سالہ

نصابِ مال کی تعیین:

شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کر دی۔ جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے ان میں امیر وغریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ:

''خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے''۔ (خروج ۳۰۔۱۵)

لیکن شریعت محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔ سونے کی زکوٰۃ وہی آدھا مثقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال [1] سونے کا مالک ہو اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سکے ہیں یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ [2] وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق [3] سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
اونٹ	پانچ عدد
گائے بیل بھینس	۳۰ عدد
بھیڑ بکری	۴۰ عدد

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا سات تولہ کے اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوۃ و الغنی جلد اول صفحہ ۱۶۴ اصح المطابع لکھنو۔

[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے۔

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں۔ پانچ وسق غلہ دوسو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے۔ ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے۔ اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دوسو درہم برابر ہیں۔ اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس[1] یا ۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات:

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی۔ (خروج ۳۰۔۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں۔ وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا۔ (احبار ۱۹۔۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے' اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے اور لاویوں میں جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہیں' نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے۔ (استثنا ۱۴۔۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی۔

۱۔ وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا۔ یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے۔ اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا کلیۃً اڑ گیا۔

۲۔ عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا اس لئے سونے چاندی کے سامانوں قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳۔ حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادِ راہ ہو اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ

[1] ہدایہ جلد اوّل باب الزکوٰۃ فی التجارۃ۔

مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

۵۔ اسی طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جوان مدوں سے بچیں، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً

۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی بلکہ ذخیرہ میں جمع ہوکر اس کا کھانا پک کر غرباء میں تقسیم ہوتا تھا لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے تا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی۔ شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا ہو مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے۔ جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے۔ اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کردی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش وعشرت کے پرتکلف سامانوں کی نذر ہوجاتا اس لئے تاکید کردی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوسکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنولاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام

قرار دی۔

۱۲۔ قرآن مجید میں زکوۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے۔

﴿اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾(توبہ۔۸)

زکوۃ کا مال تو غریبوں مسکینوں اور زکوۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں، اوران لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں جو تاوان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔(اس لئے اس کی یہ تقسیم علم وحکمت پر مبنی ہے)

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (بقرہ۔۳۷)

ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجت مند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے۔ چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ﴾ (بقرہ۔۲۲)

اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے۔

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾(بقرہ۔۲۶)

کہو جو تم مال خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔

دو ضرورتمندوں میں ترجیح:

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خودغرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے،

لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تمام تر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں۔ جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں۔ انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے پھر اہل وعیال کا۔ ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں۔ چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا ایک قسم کا مغالطہ ہے دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت' دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی۔ قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا۔ یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی نہ کہ پہلا سبب اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔

فقراء اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر وفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں' لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا نیز آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا، مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں۔ صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے۔ ارشاد ہوا، وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔ [1]

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں' اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے جو صبر وقناعت کے ساتھ فقر وفاقہ کی تکلیف برداشت کررہے ہیں کہ ان کی خبر اکثریت کو نہیں ہوسکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کردے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین وتحدید اس غرض سے بھی کی ہے تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو اور ہر کس وناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے۔ جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لایجد غنی و لا یفطن له فیتصدق علیه۔

﴿ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ‏ ۝ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُـؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ﴾(توبہ۔۸)

اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں' اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے رہیں گے' ہم کو تو خدا ہی چاہیئے زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا، اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پر چانا ہے، اور گردن چھڑانے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں میں یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ''اے شخص اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں اگر تم ان آٹھ میں سے ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔'' [1]

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ:

یہ آٹھوں مصارف نیکی' بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے جیسے بوڑھے' بیمار' اندھے' لولے لنگڑے' مفلوج' کوڑھی' یا وہ جو محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے' جیسے مبلغین' مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم جو ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ﴾ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

﴿وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا﴾ یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں اور ﴿وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ﴾ (جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے ﴿وَفِى الرِّقَابِ﴾ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے ﴿وَالۡغٰرِمِيۡنَ﴾ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے۔ ﴿وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقه و حد الغنی۔

ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔[1] اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہیں اور ﴿وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ (مسافر میں) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔[2] یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد:

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے۔ نادار یتیموں بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے۔ یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہیں جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد:

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے ان کے ساتھ نیکی احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرفدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آ سکتی۔ پیغمبر اسلام ؐ کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے، اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر:

گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسافروں کی امداد

---

[1] اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد ہی نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔

[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف باب الصدقات۔

اوران کے لئے سفر کے وسائل وذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی۔ صحرااور بیابان جنگل اورمیدان آبادی اورویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتالگا رہتا تھااوراب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ یہ وہ ہیں جو اپنے اہل وعیال عزیز واقارب دوست واحباب مال ودولت سے الگ ہوکر اتفاقات اورحوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہرانسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام وآسائش کا سامان کیا جائے اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اوراب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اوربجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اورداستان پارینہ ہوگئی ہیں اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بنک، اورآمدورفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں اورسفر وحضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اورسرمایہ داروں کی راحت وآسائش کے لئے ہوااوران کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اوردولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران، قہوہ خانے، اورآرام خانے موجود ہیں وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ کسی کی جیب میں جب تک کسی بنک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اوراقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول وعرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے سراؤں' مسافر خانوں' کنوؤں اورمہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان سپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام وآسائش پہنچ جاتا تھااورہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک ﴿اھلًا بِاھلٍ واد طاناً باوطانٍ﴾ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھااورآج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور وطریق سے واقف نہیں ہیں غریب مسافروں کو وہی آرام وآسائش حاصل ہے اورامراءاوردولتمندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گردسیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق:

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زود بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات:

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں' جماعت کے کمزوروں معذوروں اورمفلسوں کی مدد جماعت اوراس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت' جماعت کی آمدورفت اورسفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر' جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اورمقروضوں کی امداد کرنا' جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی علمی تعلیمی خدمات بجالائیں اوراس رقم کی فراہمی اورنظم و

نسق کے فرائض انجام دیں زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات:

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ ''زکوٰۃ'' کے اندر ہے۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی پاکی اور صفائی کے ہیں یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے۔ سورہ والشمس میں ہے۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴾ (شمس۔۱)

مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔

ایک اور سورہ میں ہے

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ (اعلیٰ۔۱)

مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا۔

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے۔

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (بقرہ وجمعہ۔۱)

وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

تزکیۂ نفس:

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت، مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجاء اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔ زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے غزوہ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے، جو ان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (توبہ۔۱۳)

ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا

ہے۔ مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خودغرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ﴾ (بقرہ۔۳۸)

خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے۔ بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خور اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سود خور اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے۔ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿ ليس الغنىٰ من كثرة العرض ولكن الغنىٰ غنى النفس ﴾ [1]

تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ مال کی بے نیازی کا نام ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے "تونگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بناء پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے؟

سود خور کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے وہ تو ہمیشہ اس

---

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنیٰ غنی النفس۔

تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے۔لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے ان کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر:

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے۔انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے' اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں' لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو سکتی۔محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی۔خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ خداوند! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے۔آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی۔نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مرادف تھی بلکہ صرف نیکی اور پرہیز گاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی۔حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیوں کہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔[1] آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا۔

﴿ ان المكثّرين هم المُقلّوُن ﴾[2]

جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔[3]

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی کہ جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے۔یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول

---

[1] متی ۵۔۳۔

[2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ھم المقلون۔

[3] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنيائهم۔

عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے۔ پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:

﴿ تؤخذ من اغنیاء ھم تردد علی فقرآئِھِمْ﴾ [1]

وہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی فرمایا "اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات کرنا ہی اس کا صدقہ ہے" اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی۔

﴿ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴾ (ضحیٰ۔۱)

تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی۔ احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا فرمایا۔

﴿ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ﴾ (بقرہ۔۳۶)

تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو۔

اس لطف، اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا۔ اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج:

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے،

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ۔

یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی وغربت کو سراہا گیا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے۔ عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول نجات کی راہ کا کانٹا ہے بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں لٹا نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولت مند نے حضرت عیسٰیؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا۔

''اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔''

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے فرمایا:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی ۱۹۔۲۱۔۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا' اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے' اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کو بچانا ایک نبوت عظمٰی کا فرض تھا۔ دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت، نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولت مند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے لعنت نہیں' ہنر ہے عیب نہیں' خیر ہے شر نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ [۱] آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی' اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ غریبوں نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں جو ہم نہیں کر پاتے۔ آپ نے

---

[۱] بخاری کتاب الوصایا باب ان یترك ورثة اغنیاء خیر من ان یتكففوا الناس۔

ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ دولت مند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے۔ غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ نے فرمایا یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آ رہا تھا اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ ایک دفعہ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے"۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے۔ فرمایا "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشاء یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے پھر فرمایا "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آ کر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے' لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے۔ دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ [2]

اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے بلکہ اس کا درست و نادرست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے۔ اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شر انگیز ہے۔ اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک سخی و فیاض و متواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں اسی طرح ایک متکبر' بخیل' امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں دھوکا' فریب' خیانت' لوٹ مار، جوا' سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کا سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ سود کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا۔ جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے اسی کی ملکیت قرار دی۔ چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے۔" (طیالسی صفحہ ۲۰۴)

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوۃ۔

[2] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ و کتاب الزہد والرقاق باب مایحذر من زہرۃ الدنیا۔

متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً ۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ﴾ (حشر۔۱)

بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ اُلٹ پھر کر تم میں سے دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا۔

﴿ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (حشر۔۱)

اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا

﴿ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ (محمد۔۴)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں، اصل مالک خدا ہے اور تم خود اس کے محتاج ہو پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو بلکہ محض امین ہو وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے۔ اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

﴿ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ﴾ (تکاثر۔۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو

اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ كَلَّا ﴾(ہمزہ۔۱)

برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چنتا ہو جو مال کو سینت کر رکھتا ہو اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہے گا، ہرگز نہیں۔

فرمایا رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے [۱] جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾

(توبہ۔۵)

وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ دوسرا کہتا تھا خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں۔ لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی۔ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ میں مقررہ زکوۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمات اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلے سے کم ہے اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے ایک قانونی اور دوسری اخلاقی' قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں' یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذر [۲] اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام

---

[۱] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔

[۲] بخاری کتاب الزکوۃ باب ماادی زکوتہ فلیس بکنز۔

دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکرؓ [1] اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے جیسے حضرت عبدالرحمان ؓ بن عوف [2] اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت علی ؓ مرتضی اور بعض انصار کرام' خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ (دھر۔ا)

اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (حشر۔ا)

اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ خود حاجت مند ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں تا کہ امت کے با حوصلہ افراد ہمت کے شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

﴿ ''وایں طائفہ جان و مال در باختہ اند و باہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند گفتہ ایشاں است الفقیر ماھم مباح و دمہ ھدر یعنی درویش صادق آں بود کہ بخون و مال او ہیچ دعوی نبود ... اگر مالش برند خوش گرود گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتہ اند زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک ایں طائفہ محمود نباشد از انکہ بخل ناستودہ است و بخلی تمام باید تا دویست درم را در بند کند و یکسال محبوس دارد آنگاہ پنج درم ازاں بدہد'' ﴾

اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو۔ اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو.. اگر لوگ اس کا مال اُٹھا لے جائیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ' اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے کیوں کہ بخالت تعریف کے قابل نہیں' اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں' تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے' بڑی بخالت کی حالت ہے۔

---

[1] ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکر۔

[2] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے۔

یکے از فقہاء بر سبیل آزمائش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلی گفت بر مذہب فقیہاں از دویست درم بعد از حولان حول پنجد رم باید داد او بر مذہب فقیراں در حال ہر دویست درم باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد فقیہ گفت ما ایں مذہب از آئمہ دین گرفتیم شبلی گفت ما ایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہرچہ داشت پیش سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد (مکتوب ۳۴۔ سہ صدی)

کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے؟ کہا دونوں کے، فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق ایک سال گذرنے پر دوسو درم میں سے پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دوسو، اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہئے۔ فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب آئمہ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبرؓ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا، اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہؓ صدیقہ) کو شکرانہ میں دیا،

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی۔ آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے۔ مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے اور اس لئے تاکہ بے قیدی وعدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو۔ مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج:

دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خودغرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہیں ہوتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس

نے جواب میں یہی کہا۔

﴿ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ﴾ (قصص۔۸)

مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی۔ ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی۔ یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب وہوا اقتصادی مشکلات کی ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے۔ مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے۔ سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں قیصریت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جن میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تاکہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے [1] اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے اور شام کے دولت مند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ [2]

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۷۶۔

[2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۴۵۱ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے:

زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں اور گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو۔ بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیوں کہ ہر چیز ایسی نہ ہوگی۔ اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے' اور نہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے' اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں بلکہ محنت کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ صحابہؓ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیاء کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (توبہ۔۵)

اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں اس لئے امراء کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقراء کی اصلاح:

اب دوسری طرف فقراء کا گروہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے ان کو تکلیف ہوگی، کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا۔ چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتا پا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں۔ اس نے اس غریب اور دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے۔ یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں۔ اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں، اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح ان کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں جہاں یہ تمام نجاستیں آ کر جمع ہوں گی۔ کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ غریب و امیر اور مسکین و دولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ

کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلّم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی لئے داعی اسلامؐ نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش کرنے اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا۔

﴿ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴾ (ضحیٰ۔۱)

مانگنے والے کو جھڑک نہ دے۔

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی۔

﴿ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (بقرہ۔۲۷)

ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہیں۔ تو ان کو ان کی پیشانی سے پہچانتا ہے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (بقرہ۔۲۵)

اور زادراہ لے کر چلو کہ بہترین زاد راہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا احسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ[1] اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو، دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ ﴿اليد العليا خير من اليد السفلى[2]﴾ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان

---

1. بخاری کتاب الزکوۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔
2. ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلۃ۔

کو پاک وصاف بنا دیتا ہے۔لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ ان هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس ﴾[1]

یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں ان میں سے کونسی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے۔تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتاً ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق وعادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ ادا کیا جائے یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے کہ لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی پھر رفتہ رفتہ شائد اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴾ (دھر۔۱)

ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گذاری بھی نہیں چاہئے۔پھر صدقہ دینے

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة۔

والوں کو بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرف غلط کی طرح تمہارے نامہ اعمال سے مٹ جائے گا فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ-۳۶)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ طعنہ دیتے ہیں ان کا اجران کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (بقرہ-۳۶)

مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے، خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے تا کہ اس طرح غریب لینے والا اگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور معذوروں کو در بدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۔ اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اس

لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ [1]

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحق قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رُکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبویؐ میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جن آیت میں اعلان کی اجازت ہے اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے۔ اس لئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو تا کہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیب اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو ورنہ صحابہ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔ مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سے معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیئے جائیں دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تا کہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفا الصدقة۔

چھچھور پن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت حرص اور کینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کی بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَنفِقُوا مِن طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِاٰخِذِيهِ اِلَّآ اَن تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾ (بقرہ۔ ۳۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے بہتر حصہ خیرات کرو اور ان میں سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لو گے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگ دستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیوں کہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا۔ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے۔ لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر وفاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی۔ اس بناء پر اسلام نے ان کو زکوۃ کا بہترین مستحق قرار دیا۔

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُونَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (بقرہ۔ ۳۷)

صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے۔ جو لوگ ان سے ناواقف ہیں خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵۔ لیکن بایں ہمہ حزم واحتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ

آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔[1] ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔[2]

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا' آپ نے عنایت کیا' پھر مانگا' پھر دیا' پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا "اے حکیم یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لالچ کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" حکیم نے کہا "یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا" اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔[3]

اس کی اور متعدد مثالیں ہیں اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی' فرمایا کہ:

﴿ لا تحل المسألة لرجل قوی و لا لذی مرّة سویّ ﴾ (ترمذی)

طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا

﴿ و الذی نفسی بیده لان یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یاتی رجلا فیساله اعطاه او منعه ﴾ [4]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اسے دے یا نہ دے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا۔ ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے؟ عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ آپ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور بیچو، انہوں نے اس پر عمل کیا تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراھیة المسئله۔

[2] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراھیة المسئله۔

[3] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئله۔

[4] کتاب الزکوۃ باب الا ستعفاف عن المسئله۔

گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ [1]

۲۔ لیکن جو لوگ بد قسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاحت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ نے فرمایا۔

﴿ لیس المسکین الذی ترده الا کلة والا کلتان و لکن المسکین الذی لیس له غنی و یستحی و لا یسأل الناس الحافاً ﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللّٰہ عزوجل لا یسألون الناس الحافا)

مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں، مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو وہ ہر حال میں انسان کی شرم و حیا اور غیرت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا۔

﴿ ما زال الرجل یسئل الناس حتی یاتی یوم القیامة لیس فی وجهه مضغة لحم ﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سال الناس تکثرا)

آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت و آبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا۔ پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا [2] اس طرح یہ ایک ایسا مالی و

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔

[2] تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۶۸۱۔

اقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر دادوستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

روزہ

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم:

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ضبط نفس ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں یعنی کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے۔ لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ:

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقراء کی بناء پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء اصل میں اسی طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔[1]

بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور غایت کی تشریح میں اپنے پیرووں کی وکالت کا محتاج نہیں وہ بہ آواز بلند مدعی ہے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تا کہ تم پرہیزگار بنو۔

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ط وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴ طبع گیارہ۔

میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں، تا کہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تا کہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور تا کہ تم شکر بجالاؤ

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ہیئت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں

روزہ کی مذہبی تاریخ:

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے۔ جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے۔

''روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا قومیت وتہذیب اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو''۔

آگے چل کر لکھتا ہے۔

''گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے''

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکاوشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں یعنی چالیس دن تک اکل وشرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے گجرات ودکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے۔ یونان میں صرف عورتیں تھموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ [1]

یہودیوں میں بھی روزہ فریضہ الٰہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے (خروج ۳۴۔۳۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لئے اس کو عاشورا (دسواں) کہتے ہیں یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰؑ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے۔ اسی لئے

[1] ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم

تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔[1] اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔[2]

عیسائی مذہب میں آ کر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔[3] حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسیٰؑ کے گویا پیشرو تھے وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔[4] یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگاریں بہت سے روزے بڑھا لئے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے[5] حضرت عیسیٰؑ نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا۔ غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آ کر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ بڑے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

''کیا براتی جب تک دولھا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں، جب تک دولھا ان کے پاس ہے، روزہ نہیں رکھ سکتے پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولھا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔'' (مرقس ۲۔۱۸)

اس تلمیح میں دولھا سے مقصود خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبرؑ اپنی امت میں موجود ہے امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا۔ انہوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں۔

''پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔'' (متی ۔۶۔۱۶،۱۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی'' (متی ۱۷۔۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا[6] ۔ مدینہ میں یہود اپنا

---

[1] تورات، سفر الاحبار ۱۶۔۲۹۔۳۴ و ۲۳۔۲۷۔

[2] اول سموئیل ۷۔۶ و دیرمیا ۳۶۔۶۔

[3] متی ۴۔۲۔

[4] مرقس ۲۔۱۸۔

[5] قضاۃ ۲۰۔۲۶ سموئیل اول ۷۔۶ و ۳۱۔۱۳ الوقا ۱۶۔۱۶ وغیرہ۔

[6] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴۔

عاشورہ الگ مناتے تھے۔[1] یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت:

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی' اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں' ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے' اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے۔ تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے۔ لیکن کیا خوشنما کپڑوں عالی شان عمارتوں لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال زر و مال اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی اور زندہ رہے ہیں' بروایت عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایۂ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا' روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدرمق پر موقوف ہے اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط، وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی چیز تمام فروق و امتیاز کو محیط ہوگی۔ انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی۔

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۵۶۲۔

حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتاً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے' لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے' اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغناء کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے۔ مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہئے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے۔

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا' تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا۔ لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

﴿ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تا کہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت:

یہ مادّی عالم جس طرح مادّی نظام اور قانون کا پابند ہے' خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام' قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے اسی یقین کے ساتھ طبّ روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے۔ معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیوں کر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنۃ اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک

عام تاریخی قانون بنالیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول وقوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالم انسانی سے الگ ہوکر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ [۱] کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز وشب بھوکا اور پیاسا رہا [۲] اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حراء نام مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثناء میں ناموس اکبر ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ [۳]

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (بقرہ۔۲۳)

رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (دخان۔۱)

ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر۔۱)

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ الصلوۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لئے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط، ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا بھوکا اور پیاسا [۴] سربہ

---

۱ خروج ۳۴۔۲۸۔

۲ متی ۴۔۲۔

۳ صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدء بعثت میں ہے

۴ روایات سے اگرچہ بتصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غار حرا میں روزے رکھتے تھے' تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غار حرا میں روزے بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے۔ آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے دیکھو خضری مصری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۳ وصفحہ ۴۔

زانو تھا۔ اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف) نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی کے لئے ضروری تھا کہ

﴿ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ ﴾ (آل عمران۔۴)

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہئے جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا تا کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو۔ یہ جذبات وحالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گذاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ:

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا۔ روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لئے تھے اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔ نماز وحج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عبادات کو امراض روحانی کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتگی اور لذاتِ حسیّہ کے انہماک وتوغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے مکہ میں یہ تمام ساز وسامان مفقود تھے۔ بلکہ خود کفار کے جور وستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی اب وہ وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریفتہ بنائے اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا۔[1] اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ وزرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۲۴۷ مصر وزاد المعاد ابن قیم جلد اول صفحہ ۱۶۰ مصر۔

کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے شکم سیروں کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔علامہ ابن قیم نے زادالمعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لئے موزوں تھا۔

ایام روزہ کی تحدید:

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی، جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اگر ایک دوروز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا۔اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان۔چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گذارا، اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے۔چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے اس لئے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا بلکہ

﴿ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی اس کے بعد فرمایا گیا۔

﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

چند گنے ہوئے دن۔

مدت کی تعیین اب بھی نہیں البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گنے ہوئے دن۔اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

﴿ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تو جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو

یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے مقرر ہوں گے ورنہ ﴿مَعْدُوْدَاتٍ﴾ (گنے ہوئے) ﴿عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا' پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ "مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کے لئے' اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی۔

اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ چند گنے ہوئے دن۔ ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی کے دن ہی تو ہیں۔[1] بہر حال رمضان کو ماہ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ (بقرہ۔۲۳)

وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت ہے' تم پر فرض کئے گئے' ارشاد ہوا۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔

---

[1] عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہئے کہ ایّامُ العربَ کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں' زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کردے' اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے اور ہزار ہا انقلابات کو ایامُ اللہ کہا ہے (ابراہیم۔۱) ان کو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کردے' یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے' اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (سبا۔۲) اور فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (گذرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر' اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے' وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں' جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ بھی کلی نہیں' بلکہ عموماً ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں مستعمل ہیں' ایام کا لفظ ان میں نہیں' اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے' اور وہ ایوام ہے' جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے' سند کے لیے دیکھو رضی شرح کافیہ جلد دوم بحث جمع مکسر' اور لسان العرب لفظ یوم۔

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین وتحدید اور اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ کی تشریح ہوگئی' عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جوظرف زمان[1] ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے ﴿صَامَ شَهْرًا﴾ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے' بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے ﴿صَامَ سَنَةً﴾ (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ شھر یعنی مہینہ کہا گیا ہے اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا۔ قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہیں جیسی روایت ہو وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا جیسا کہ سرور کائنات ﷺ تمام صحابہ کرام خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ:

قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے۔

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

لفظ شَھِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو جس میں وہ ماہ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو مگر ماہ صیام کا وہاں گذر نہ ہو یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی جہاں شب وروز کا وہ نظام موجود نہیں جو باقی متمدن دنیا میں ہے۔ مثلاً جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے)

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں' وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے' تا کہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہوسکتی تھی وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔[2]

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ وظرف زمان صفحہ ۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۶۸ء' جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ (بقرہ:۴۲) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں، کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے''س''

۲؎ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں''س''۔

معذورین:

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لئے ارشاد ہے:

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بناء پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کرلے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا یا بار بار کے تجربوں کے بعد اس شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لئے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اسکے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا۔

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے۔

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔

۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے۔ ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے۔ اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے (الفوز الکبیر باب ناسخ و منسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاعت کو وسعؔ کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا

پڑے گا اور یا آجکل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں' وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں' حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ غرباروزے رکھیں اور امراء فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں۔ ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لئے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔ [1]

---

[1] اطاقہ، طاقۃ کا باب افعال سے مصدر اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا' فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقۃ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں والطوق الطاقة ای اقصی غایته وهو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعله بمشقة منه طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے اطاقۃ کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ (بقرہ۔۴۰)

اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے

''جس کی ہم کو طاقت نہیں'' کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں' یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے' کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا' فرمایا:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرہ۔۴۰)

اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا' لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالیے جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں' صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ:

﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (بقرہ۔۳۳)

آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے' بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، ابوداؤد میں ہے۔

عن ابن جبير عن ابن عباسؓ وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمراءة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا۔

ابن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں' ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے' فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں' اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں‘ ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوف یا سفر تو ان کے لئے یہ آیت ہے۔

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (بقرہ)

تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے‘ اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے اس میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے‘ اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو‘ جیسے کوئی دائم المرض ہو‘ بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھتا ہو‘ تو وہ روزہ قضا کرے‘ اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لئے یہ آیت ہے۔

﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴾

اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں‘ ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پر قادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالا ولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب:

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گولغزش گاہیں موجود ہیں۔ چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار (۱۶۔۲۲۹) میں ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی‘ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی اب الحمد للہ یہ تائید بھی ہاتھ آ گئی ہے۔ سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود‘ شرح ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

لکن مع شدة وتعب و مشقته غطیته ‘اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

ان وجوہ سے وعلی الذین یطیقونه فدیه کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں‘ بلکہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

''اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے''

توراۃ کے سفر العدد (۲۹۔۷) میں ہے:

''اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو''

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے۔ صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزہ کا حکم دیا ہے وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہیں

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

اسلام کا عام قانون ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (بقرہ۔۴۰)

خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے

﴿ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (اعراف۔۱۹)

وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

ان امور کا منشاء یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے۔ روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات:

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان میں اکثر روزہ صرف پیرووں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا۔ مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروان مذہب کے لئے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس نے تمام پیروؤں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (بقرہ۔۲۳)
اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے۔ شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی ان میں تغیر وتبدل ناممکن ہے۔ اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہیں۔ اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی ونرمی بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص واستثناء نظر سے نہیں گذری' توراۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا' بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو۔ [1] لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور ومجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ بچے مستثنیٰ ہیں' عورتیں ایام حمل ورضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں۔ بڈھے' بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں' کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں، مستثنیٰ ہیں۔ بیمار ومسافر اور عارضی معذور' بیماری' حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَه' فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (بقرہ۔۲۴)
اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترمذی میں ہے

﴿ عن انس قال النبی ﷺ ان اللّٰہ وضع عن الحامل و المرضع الصوم ﴾
حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔

۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے۔ یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی۔ اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵۔ جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا۔ عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے

[1] احبار ۱۶۔۲۹۔

تھے۔ یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا۔ اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا۔

﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا' عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے سو کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر نا جائز تھا۔ ابتداءً میں اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئی وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آ گیا، اس پر یہ آیت اتری

﴿ وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الۡخَيۡطُ الۡاَبۡيَضُ مِنَ الۡخَيۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دے دی۔

﴿ اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمۡ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ وَعَفَا عَنۡكُمۡ فَالۡئٰنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمۡ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لئے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی' خدا جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا' اب بیوی سے ملو جلو اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

﴿ عن ابی ھریرۃؓ من اکل او شرب ناسیًا فلا یفطر فانما ھو رزق اللّٰہ ﴾ (ترمذی)

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جو بھول کر کھائے یا پیئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔

۹۔ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

﴿ قال النبی ﷺ الا لا یفطر من قاء و لا من احتلم ﴾ (ابوداؤد)

پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا جس کو قے ہوگئی[1] یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

---

[1] قے ہونے کی فقہ حنفی میں کئی صورتیں ہیں، ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب وزینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔ حضرت عیسٰیؑ نے فرمایا۔

''پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھو تا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے '' (متی ۶۔۱۶)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے۔ اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا' سرمہ لگانا' خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں' منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے۔ اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف' مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ ہنسی' خوشی رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے۔ خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے۔ مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا۔

﴿ أيكم مثلي انى ابيت يطعمنى ربى ويسقينى ﴾

تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)۔

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے۔ جب مہینہ گذر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔[1]

روزہ کے مقاصد:

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں؟ گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کے فرائض کی عمارت روحانی' اخلاقی' اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے اور ان مصلحتوں اور ان منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے۔ چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیئے ہیں۔

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶۳۔

﴿ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۳)
تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔
﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)
تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔
﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)
تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے تب توراۃ کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا، محمد رسول اللہ ﷺ غار حرا میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضان الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی:

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہئے تھا مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گذاریں، چنانچہ فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۳)
اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسرے نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ:

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان

کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی، جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تا کہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تا کہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ:

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیز گاری اور صفائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرمایا گیا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصوم)

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات میں ایک

وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے۔ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے'

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے

﴿ فِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے اگر یہ نہ ہو سکے

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

تو دس روزے رکھیں' تین حج میں اور سات گھر آ کر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے' جو منیٰ لے جا کر ذبح کی جائے اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾ (مائدہ۔۱۳)

یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا' اگر یہ نہ ہو سکے

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴾ (مائدہ۔۱۲)

تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ﴾ (مجادلہ۔۱)

تو دو مہینے متواتر روزہ رکھے۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو

﴿ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾ (مجادلہ۔۱)

تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳۔ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیمؒ سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔ روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادِرواں کی طرح[1] ہوتی تھی اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد واعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو اور مال ودولت سے مالا مال ہوتا، ہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر وضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدوجہد، سختی ومحنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا کا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے۔ جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار وسحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم او رفتور سے خالی ردل ودماغ تبخیر معدہ کی مصیبت سے پاک ہو چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

صادق ہے۔

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔[1] اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اگر اس کی سکت نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْآ اَيمَانَكُمْ ﴾ (مائدہ۔۱۲)

تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو:

﴿ اَوْعَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ﴾ (مائدہ۔۱۳)

یا اس کے برابر روزہ تا کہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے۔ اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے۔ اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (نساء۔۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی۔ روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں۔ دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہونا، ہمارے غور و فکر اپنے اعمال کے محاسبہ اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے

---

[1] احبار ۱۶۔۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳۔۲۷۔

بھی زیادہ ہو جاتی تھی [1]۔

۱۰۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے۔ اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن روح کا روزہ نہ ہوا۔ اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے اور نہ جہالت (غصہ) کرے یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔ [3] بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کرو۔ [4] صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے؟ فرمایا جھوٹ اور غیبت سے۔ [5] چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ [6]

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے جو ریا اور نمائش سے بری ہے۔ جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے اس لئے:

﴿ الصوم لی و انا اجزی به ﴾ [7]

روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی جلد اول صفحہ ۳۔

[2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۲۵۵ و ترمذی باب الصوم صفحہ ۶۴ و ابوداؤد صوم صفحہ ۳۲۶ و ابن ماجہ صوم صفحہ ۱۲۲۔

[3] صحیح بخاری صوم جلد ا صفحہ ۲۵۲ صحیح مسلم صوم جلد ا صفحہ ۳۶۲ مصر و موطا امام مالک صوم ص ۹۷ و نسائی ص ۳۵۵۔

[4] سنن دارمی صفحہ ۲۱۸ مجمع الفوائد بحوالہ نسائی صفحہ ۱۵۲ میرٹھ۔

[5] مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۲ میرٹھ۔

[6] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۸۔

[7] صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم۔

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (زمر)

صبر کرنے والوں کی مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے اس لئے روزہ دار بھی ''صابرین'' کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (بقرہ۔۵)

اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں۔[1]

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں سے ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاپوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (احزاب۔۵)

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ جلد ا صفحہ ۱۹۹ مصر۔

حج

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد اور ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی۔ اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختلف سی آبادی بنی۔ پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی' اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے' وہ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے عہد میں ایک خاندان کا تبلیغی مستقر بنا۔ پھر حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے۔ ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا۔ نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ [۱]

حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی۔ یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی۔ ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لئے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ آثار' قومیات' لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔ [۲]

---

[۱] توراۃ اور بابل' کلدان' یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔

[۲] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب وشام کی سرحد کا رخ کیا اور بحرمیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک، مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مقرر کی۔ یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصرو شام، حجاز ویمن اور حجاز ویمن سے مصروشام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتالگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیمؑ کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمدورفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے۔ یہاں وہ عراق وشام کی جبار وقہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ:

حضرت ابراہیمؑ کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں:

''تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا' بیت ایل اس کے پچھم اور عیٔ اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا(۱۲۔۱۷۔۸)

اس کے بعد ہے:

''اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔'' (۱۳۔۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا:

''اٹھ اور اس ملک کے طول وعرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطون میں جو حبرون میں جارہا اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔'' (۱۳۔۱۷۔۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا۔ حضرت اسحاقؑ کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی۔

''اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحاقؑ کے نوکروں نے کنواں

کھودا۔" (پیدائش ۲۶۔۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں:

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا' کھڑا کیا' اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا" (۲۸۔۱۸۔۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے:

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے' تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو' کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا' اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو' تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو" (خروج ۲۰۔۲۵۔۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب:

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لئے بارہ ستون بنائے اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا' اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا" (خروج ۲۴۔۴۔۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح' قربان گاہ) بتایا گیا ہے' اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر' اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا' اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں کعبہ' مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے' بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کی شرائط:

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آ چکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا' وہ حضرت اسماعیلؑ تھے' اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے' وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا' اور وہ جانور اس کی طرف قربانی کئے جاتے تھے' جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے' وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے' جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی' اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے:

توراۃ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی' اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ

اوران کی اولاد ہرقسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی' توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے:

''خداوندفرماتا ہے'اس لئے کہ تونے ایسا کام کیااوراپنا بیٹاہاں اپنااکلوتا بیٹادریغ نہ رکھا' میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا' اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے مانند بڑھاؤں گا' اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہوجائے گی' اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی' کیونکہ تونے میری بات مانی۔'' (۲۲۔۱۶۔۱۷۔۱۸)

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی' پھراس نے ان کو پورا کیا' تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کولوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں۔

﴿ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۶)

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنااور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے' جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کردے' اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا۔

﴿ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (صافات۔۳)

اے ابراہیم تونے اپنا خواب سچ کر دکھایا' ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ ﴾

خدایا! تو محمد اور محمد کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کر' جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی' یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی' یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کردینے کی نذر تھی' یہ خدا کی اطاعت' عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا' یہ تسلیم ورضا اور صبر وشکر کا وہ امتحان تھا' جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی ''پیشوائی'' اور آخرت کی ''نیکی'' نہیں مل سکتی' یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کردینا نہ تھا' بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں' تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی' اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کردینا تھا' اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے:

اسلام کے لفظی معنی ''اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کردینا اور اطاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکادینا ہے'' اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے' یہی سبب ہے کہ

ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفہ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے' فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ (صافات۔۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے' (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔

﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا' لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے' ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا' اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا' جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)۔

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا' اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا' یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے' اور اسی بار امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے' کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں' اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے' چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرماں بردار) بنا' اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا' اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا' اور ہم کو معاف کر' بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے' ہمارے پروردگار اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے' اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے' اور ان کو پاک اور صاف کرے' تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ تھے' یہ کتاب قرآن پاک تھی' یہ حکمت سینہ محمدی کا خزانہ علمی و عملی تھا' اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی؟ توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے' بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے' اور بلوطون کے جھنڈ یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے' لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے' چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبرانی' کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ میں ۱۸۹۰ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے' اس میں اس مقام کا نام "مُـرِیّا" لکھا ہے' اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا

ہے‘اس کا تلفظ’’موریا‘‘ کیا ہے‘اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے‘اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

’’خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک‘ گفت کہ اکنون پسر خودرا کہ یگانہ تست واورا دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برڈ واورا آن جابر یکے از کوہ ہائکہ تبونشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران‘ بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدہا) خودرا بیاراست و دونفراز نوکران خودرا باپسر خویش ’’اسحاق‘‘ برداشتہ وہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شدؔ وبسوے آں مکانیکہ خدااورافرمودہ بوذرفت‘ ودرروز سوم ابراہیم چشماں خودرا بلند کردہ آن مکان راز دور دید‘ آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما ایں جابمانید‘ تامن باپسر بدانجا رویم‘ وعبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزدوشما باز آئیم‘‘ (پیدائش،۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے‘اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے‘اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے‘اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم نے ’’الرای الصحیح فی من ہوالذبیح‘‘ نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل ومفصل لکھا ہے‘اس لئے یہاں بحث بے محل ہے‘ بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی‘ وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے‘ چندروز کی مسافت پر تھی‘ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گذاری جائے‘ وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو‘ خاص کر اس لئے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی‘ اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف ومشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ ’’میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں‘‘۔ یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں اور نہ یہود ونصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے‘ اور نہ عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے‘ اور نہ بیت المقدس یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کی خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی‘ اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی‘ تاہم اصل شے باقی تھی‘ عرب میں بت پرست بھی تھے‘ ستارہ پرست بھی تھے‘ کافر بھی تھے‘ مشرک بھی تھے‘ بلکہ عیسائی بھی تھے‘ اور یہودی بھی تھے‘ مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا‘ یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے‘ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں‘ حضرت ابراہیمؑ‘ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ [1]

---

[1] اخبار مکہ للازرقی وفتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ وسیرۃ ہشام۔

مکہ اور کعبہ:

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا "سمت القدم" ہے وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا' سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی' اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ:

﴿ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔

وہ وہی تھا' لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا' حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا' تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے' چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳۔۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی ﴿اَلْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ (پرانا گھر) تھا' کوئی نیا گھر نہ تھا' حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی' فرمایا ﴿اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ﴾ (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی' حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا' حضرت ابراہیمؑ نے عراق' شام' مصر' ہر جگہ پھر کر آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا جو با سطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا' اس لئے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا ﴾ (حج۔۴)

اور ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانہ بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کو ان کی جائے پناہ اور ٹھکانہ بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔

توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا کیوں کہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں' بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے ﴿وَ طَهِّرْ بَیْتِیَ﴾ (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لئے پاک وصاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور کبھی اس کا نام بیابان تھا اور آخر یہی

بیابان اس کا نام پڑ گیا۔ لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان وصحرا ہی کے ہیں۔[1] اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

﴿ رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ ﴾ (ابراہیم۔۶)

خداوندا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لا کر بسایا ہے۔

تو حقیقت میں یہ بن کھیتی کی ترائی اور بے آب وگیاہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

﴿ وَارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور خداوند! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی ''گھر'' کے ہیں[2] اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل وکلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے[3]۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گذر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں بک کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّةَ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

کعبہ کے لغوی معنی ''چوکھونٹے'' کے ہیں چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

''ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔''[4]

---

[1] اخبار مکہ للازرقی وفتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ وسیرۃ ابن ہشام۔

[2] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے از صفحہ ۵۷ تا صفحہ ۶۰ طبع اول۔

[3] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴ مصر۔

[4] گبن کی تاریخ عروج وزوال روم باب ۵۰۔

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں گے خانہ کعبہ ہے۔ رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار ریلز یر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر رسوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا:

''تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔''[1]

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔[2] یہاں تک کہ عیسائی عرب شعراء بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصا حصہ تھا۔[3] اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے:

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی:

﴿ اَنْ يّٰۤـاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ .... وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ (صفّت۔۳)

یہ کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں.... اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے۔

---

[1] نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء۔

[2] مولانا حمید الدین صاحب نے اپنے تصنیف الامعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیئے ہیں۔

[3] کتاب الامکنہ والازمنہ امام مرزوقی، طبع حیدر آباد (جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰۔

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ط وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۵،۱۶)

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا' اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ' اور ابراہیم واسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا' اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے' خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا' پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) اے ہمارے رب (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے' اے ہمارے رب ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک وصاف بنائے ، بے شک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے گا بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ یاد کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بن جا۔ اس نے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابعدار (مسلم) بن گیا۔

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ م بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ○ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (حج۔۴)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف

قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے' وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے' تا کہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیئے ہیں ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں' اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں' یہ سن چکے' اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴾ (ابراہیم۔۶)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو' تو بخشنے والا مہربان ہے' اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے' اے ہمارے پروردگار یہ اس لئے تا کہ یہ تیری نماز کھڑی کریں' تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تا کہ یہ تیرے شکر گذار رہیں' اے ہمارے پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا' تو ابراہیم کے دین کی پیروی کر شرک سے منہ موڑ کر' اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا' بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا' وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت' اور دنیا کے لئے راہ نما اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں' ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے' جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز رہے' تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے' ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے تا کہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائیں یہ ٹھکانہ عنایت کیا جو ازل سے اس

کام کے لئے منتخب تھا تا کہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گذاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لئے یہاں بساتا ہوں تا کہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجا لائیں۔ ان میں جو نیکوکار ہوں وہ میرے ہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے۔ تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں اور یہاں اسماعیلؑ کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں، اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

او پر تورات کے حوالوں سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے وہاں قربانی کرتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ جو شخص نذر کیا جاتا تھا وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا۔ نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو۔ (خروج ۲۰۔۲۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے۔ تورات کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں "لبیک" کہا اور اردو میں ہے کہ "میں حاضر ہوں" کہا۔ یہی صدا لبيك اللّٰهم لبيك اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے۔ یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے، حج میں یہ طواف کہلاتا ہے۔ غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت:

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس

معائدہ کو عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے' یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے' یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور دوڑتے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

﴿لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ' لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ' اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ﴾ (صحیح مسلم، کتاب حج)

میں حاضر ہوں اے اللہ' میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں' اور سلطنت تیری ہی ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ' اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے پھر مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں' روتے ہیں' قصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت' بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے[1] یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں ایک ہی لباس اور شکل و صورت ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا و مغفرت کی پکار' گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم' اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہو کر یہ روحانی منظر ایسا کیف' ایسا اثر' ایسا گداز' ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی پھر اپنی نذر کے دن پورے کر

---

[1] ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرك الامام بجمع فقد ادرك الحج۔

کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اسی فدویت اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)

﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴾
(انعام۔۹)

میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا' موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔

﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ (انعام۔۲۰)

میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے' جو تمام دنیا کا پروردگار ہے' اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے' میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام کا) اقرار کرتا ہوں۔

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات:

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی۔ عام اہل عرب نماز کے اوقات' ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی' زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں۔ روزے نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے' لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول وارکان پہلے سے موجود تھے' صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا' یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں' اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور علائے کلمۃ اللہ ہے لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام ونمود کا ذریعہ بنالیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے۔ مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصا تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آبا واجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ﴾ (بقرہ۔۲۵)

جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔

۲۔ قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے' یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے' محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں اور یہ آیت اتری:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (حج۔۵)

خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں' نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:[۱]

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (بقرہ۔۲۵)

زادراہ ساتھ لے کر چلو کیوں کہ بہترین زادراہ پرہیزگاری ہے۔[۲]

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے[۳]۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔[۴] ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔[۵] اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (اعراف۔۳)

ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر طواف نہ کرنے پائے۔ چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی۔[۶]

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے' اسلام نے قریش کے اس

۱۔ بخاری جلد اصفحہ ۲۰۶ کتاب الحج۔

۲۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداء۔

۳۔ بخاری جلد اصفحہ ۲۲۶ کتاب الحج۔

۴۔ بخاری جلد اوّل صفحہ ۲۰۶ کتاب الحج۔

۵۔ بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۶۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب الحج باب لایطوف عریان۔

امتیاز کا خاتمہ کر دیا چنانچہ یہ آیت اتری:[1]

﴿ ثُمَّ اَفِيضُوا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا۔[2] یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے۔ شور وغل ہوتا تھا دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا، حکم آیا:

﴿ فَمَنۡ فَرَضَ فِيهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الۡحَجِّ وَمَا تَفۡعَلُوا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فحاشی ہے، نہ لڑائی دنگا ہے، اور تم جو نیکی کرو گے، اللہ کو معلوم ہوگی۔

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے ان میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا جو دیر میں واپس ہوتے تھے چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

﴿ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِي يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ لِمَنِ اتَّقٰى ﴾ (بقرہ۔۲۵)

جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے۔ انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔[3]

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بڈھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ جا رہا ہے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے۔ ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔ چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔[4] اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں۔ آپ نے ایک بار اسی قسم کی

۱۔ بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۶

۲۔ بخاری جلد اول ص ۵۴۳

۳۔ بخاری جلد صفحہ ۵۴۱

۴۔ ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع۔

ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے۔ [۱] اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے سوار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لیے جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔ [۲]

۱۱۔ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اس کو کار ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت وملامت کی اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: [۳]

﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ (بقرہ۔۲۴)

گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈلوا لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی۔ [۴] اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے۔ آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔ [۵] ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے، آپ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو، یہ نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔ [۶]

۱۳۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔ [۷]

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو

۱۔ ترمذی کتاب النذر والایمان۔

۲۔ بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۹ کتاب الحج۔

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۴۲۔

۴۔ نسائی کتاب الحج صفحہ ۴۶۱ باب الکلام فی الطواف۔

۵۔ بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف۔

۶۔ فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۸۶۔

۷۔ صحیح بخاری باب ایام الجاہلیہ۔

طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لئے آتے تھے وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے ان کو حج سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے۔ اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہیں' اس لئے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں، فرمایا: [1]

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

تمہارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا' اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

۱۵۔ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے جو مشلل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ (بقرہ۔۱۹)

صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ کرے اس کے لئے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے۔

حج کے ارکان:

اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

احرام:

تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا

---

[1] اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری، دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے۔ اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لیے ہو گیا اس لیے اب اس میں تجارت مناسب نہیں۔ یہ آیت اس خیال کی تردید کے لیے اتری لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ۔)

[2] صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۳۔

اعلان ہے۔احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے۔اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش ونشاط، زیب وزینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔بیوی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی وشہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے لیکن خدا کی بارہ گاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ وگدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے۔ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لئے باہر رہے۔یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تا کہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو۔یہ گویا شہنشاہ عالم وعالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ' بے تکلف اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف:

یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا' اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کی قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی۔چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو[1] اور حکم ہوا کہ:

﴿وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ﴾ (حج۔۴)

اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔

حجر اسود کا استلام:

حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں۔یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے۔خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا۔کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا۔اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی ومستدرک حاکم۔

ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے۔ اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے' اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں اور یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے۔ مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، آئمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔[2] الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے' ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا:

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیلؑ کی جگہ مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہؑ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا۔ یہ صفا مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے

---

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔

[2] صحیح مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب استلام۔

کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے۔

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ (بقرہ۔۱۹)

بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس کا اس پر پھیرے لگانا گناہ نہیں۔

وقوفِ عرفہ:

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ:

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے۔ اسی لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا:

﴿ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا، اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام:

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قربانی پیش کی تھی اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔ [1] رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی النحر فی الحج۔

سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی‘ ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے۔ یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کی بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف‘ محبت‘ مساوات‘ اور یک جہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا:

﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی:

یہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ (حج۔۴)

اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے

﴿ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے۔ جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔

حق راس:

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔[1] ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا

[1] تورات قضا ۱۳۔۵۔ گنتی ۶۔۵

ہے تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیئے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔[1] چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

﴿ مُحَلِّقِيْنَ رُءُ وْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ﴾ (فتح۔۴)

اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔

﴿ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُ وْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔

رمی جمار:

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لئے شیطان کو ''رجیم'' یعنی ''کنکری مارا گیا'' کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت ﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ (الفیل) میں ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے۔ یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی ترمیھم کی سنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔ چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔[2] قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (بقرہ۔۲۵)

جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے بڑھ کر۔

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت:

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے تا کہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد، اپنے گناہوں

[1] ابن سعد جزء ثانی قسم اول صفحہ ۳۷ و سیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ واقعہ عمرو ابن امیہ و جز ناصیۃ واعتقہ۔

[2] مشکوۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔[1] اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ ﴾ (حج۔۴)

اور تا کہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکان حج ہے۔ سورہ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (حج۔۴)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا و مروہ کی نسبت ہے:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔

اور سورہ حج میں فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (حج۔۴)

یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تا کہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب:

حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاک بازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو۔ وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے شکار تک اس کے لئے جائز نہیں کیوں کہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔

﴿ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج۔

ہے اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔

﴿ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ (مائدہ۔۱)

حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے تا کہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

﴿ وَلَآ آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (مائدہ۔۱)

اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے' جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا ۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ﴾ (مائدہ۔۱۳)

اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے مویشی میں سے۔ اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گناہ کا اتار ہے کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے تا کہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے۔ اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں:

محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے۔ وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلؑ کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے۔ آئیں ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع و مرکز اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنایا اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف کرو اور جب ابراہیمؑ نے کہا میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے۔

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تابعدار گروہ بنا' اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرمانبردار گروہ بنا' اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا' اور ہم کو معاف کر' تو بے شک معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے' اور ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیج۔

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ (حج۔۴)

اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ ٹھکانا دی کہ میرا شریک نہ بنانا' اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں' کھڑے ہونے والوں' رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف کر' اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی اونٹنیوں پر سوار ہو کر اور دور دراز راستہ سے آئیں گے تاکہ فائدے کی جگہوں میں آکر جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾ (ابراہیم۔۶)

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو امن والی بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا' تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے' ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے۔ ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی رکھیں، تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف جھکیں اور ان کو پھلوں کی روزی دے تاکہ شکر گذار ہوں۔

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے:

۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تا کہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳۔ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں، آباد ہوئے ہیں اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو تو اس بے ثمر اور شورزمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہیں گے تا کہ یہاں آ کر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں خداوند! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۔ خداوند! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت:

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرّہ ذرّہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب ہی کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت' قومیت' تمدن و معاشرت' رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملّت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں' جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں' اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں۔ یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے

اسباب ہیں اس لئے یہ حرم ربّانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیّت اور وطنیت کی تنگنا ئیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں مگر ملّت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم، تمدّن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دنیا کی قومیں ''ہیگ'' (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوانہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے یہ حج کا موسم ان کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر، اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (بقرہ۔۲۵)

بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے کو پسند نہیں کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (بقرہ۔۲۵)

اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمارا کھلا دشمن ہے

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بہ سال دور دراز اقلیموں ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے' جب سفر اور آمدورفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا' وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ وتنہا رہا' ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے **سمعاً و طاعتاً** کہا' آپ کے بعد خلفائے راشدینؓ، اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرامؓ، آئمہ اعلام نے اسی طرح سال بہ سال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین وتبلیغ کی خدمت ادا کی' اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم' محدّث' مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بہ سال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے۔یہیں آ کر بخارا کا باشندہ اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی سندھی (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی۔مصر کی تصنیف وروایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر وشام میں پہنچ جاتا تھا۔ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابوہریرہؓ کے مستفیدوں سے اور انسؓ کے حلقہ کے فیض یاب علیؓ کے شاگردوں سے مستفید وسیراب ہوتے تھے۔یہی وہ مرکز تھا جہاں آئمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات وواقعات ومغازی اور احکام وفرامین ووصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا اور آپ کے سیر ومغازی اور احادیث وتعلیمات مرتب ومدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور آئمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات ومعلومات سے مستفید ہو کر اجماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدّون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات ومعلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم وبیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا' پہاڑ' جنگل' آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے دردوغم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔یہیں آ کر چینی مراکشی سے' تونسی ہندی سے' تاتاری حبشی سے' فرنگی زنگی سے' عجمی عربی سے' یمنی نجدی سے' ترکی افغانی سے' مصری ترکستانی سے' روسی الجزائری سے' افریقی یورپین سے اور جاوی بلغاری

سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات وواقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی وتری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی۔ دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے۔ مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی۔ یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزقِ ثمرات:

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شوروریانے میں بسنے والوں کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی کہ خداوندا میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لئے زکوٰۃ خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہو جاتے جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (تکوین ۳۷۔ ۲۸۔ ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ میں ہے۔ وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام ومصر وروم تک جاتے تھے۔ [1]

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ واعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور وبے حاصل زمین

[1] تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارت العرب قبل الاسلام۔

کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر مال کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہل مکہ کے قوت لایموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت:

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے۔ اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں۔ اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے [1] اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت:

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

﴿ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزا بھی ملنے لگتا ہے

تجارت:

قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے:

﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (مائدہ۔۱)

اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش

---

[1] یہ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر ۱۳۴۴ھ میں کیا تھا مگر اس کے ۲۴ برس بعد ۱۳۶۸ھ میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا۔ اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے۔ جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی۔ بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپے، گائے بیل کی قیمت اسی سے سو روپے تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی۔ اب اس تخمینہ کی بناء پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے" "س" ۳۰ محرم ۱۳۷۱ھ اور اب ۱۴۰۴ھ میں تو قیمت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہے (ناشر)

کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال واسباب کولوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہ ؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ جیسی کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى وَاتَّقُونِ يَاُولِي الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)۔

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے۔ وہ کون سا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کی مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت:

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب وروح میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے۔ وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے۔ وہی ملّت ابراہیمی کا مقام اسلام کا مولد اور قرآن کی مہبط ہے اس لئے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازاروں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان جس ملک میں بھی ہے اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے

خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے۔ گرد وپیش آگے پیچھے داہنے بائیں ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت۔ آج انگریز ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار اور افریقہ اور کینیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے۔ وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے۔ وہ تمدن معاشرت اخلاق تعلیم لٹریچر ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن ومسکن کی پیروی کرتے ہیں جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے ایک ایک در ودیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب وتمدن کے پاک وصاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلا تشبیہ اس قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم وفنون کا مولد ومسکن سمجھتے ہیں۔ ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرکوں کا فراس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک وصاف اور کفر وشرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو اُمّ القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے۔ اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل ومرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت:

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے۔ آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در ودیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا۔ یہیں حواؑ نے آ کر ان سے ملاقات کی۔ یہیں نوحؑ کی کشتی نے آ کر دم لیا۔ حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں ہجرت کی حضرت اسماعیلؑ نے یہیں سکونت اختیار کی۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے۔ ہیں وہ دوسری پہاڑی

ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی' یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ مشعر حرام اور عرفات ہیں جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ملّت ابراہیمی کی بنیاد پڑی' یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہیں وہ گلیاں اور راستے ہیں جو جبریل امین کی گذرگاہ تھے' یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی' یہی وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ترپن سال بسر کئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے' کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں' جہاں اس نے کہا:

﴿ فِيهِ اٰيَاتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيمَ ﴾ (آل عمران۔۱)

اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں، ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے۔ جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے' آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (حج۔۴)

اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب سے ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (حج۔۴)

اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

خالص روحانیت:

حج کی حقیقت میں گذر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات' کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لئے خاص ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ' انابت اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ (بقرہ۔۱۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے' اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہوکر' جہاں اکثر نبیوں رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہوکر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا' اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد واقرار کرنا ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہوکر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم وکرم لطف وعنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے' سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گذارتا ہے' اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔ [1]

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے۔ وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہوکر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) موطا امام مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل' رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی و ارنا مناسکنا و تب علینا ''اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما'' کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے' اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ ﴿لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ﴾ ''خداوند میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں'' کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ طواف میں' سعی میں' کوہ صفا پر' کوہ مروہ پر' عرفات میں' مزدلفہ میں' منیٰ میں اور ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ ﴿اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ﴾ [2] ''گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے'' اس لئے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں لیکن حج کے مشاعر' مقامات اور ارکان اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں صدق توبہ کے لئے

[1] نسائی وترمذی و بزار وطبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب الحج جلد اول صفحہ ۱۶۳ میرٹھ۔

[2] سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔

بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی،وہ ماحول وہ فضا وہ تمام گنہگاروں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری،فریاد وبکا اور آہ ونالہ،وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز ونیاز کے معاملات گذر چکے ہیں،دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین مواقع ہیں' جہاں حضرت آدم وحوا نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی۔جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی۔جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی۔جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں' جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائیں مانگیں وہی مقامات،وہی مشاہد،اور دعاؤں کے وہی ارکان' ہم گنہگاروں کی دعائے مغفرت کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگان الٰہی پر عرش الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است۔

انسان کی نفسیات (سائیکالوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حد فاصل کی تلاش کرتا ہے جہاں پہنچ کر اس کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حد فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصان الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف،خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے سرور کائناتؐ نے یہ فرمایا:

﴿ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ ﴾[1]

جس نے خدا کے لئے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن

---

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے۔

اس کی ماں نے اس کو جنا۔

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی۔ یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

﴿ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

پھر طواف کے لئے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو، بے شک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو یا ان سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ (حج کی دعامیں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے، اور ایسوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں مثلاً

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں۔ معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا ایک لباس میں ایک صورت میں ایک میدان میں ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

الغرض ''حج'' اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

جہاد

﴿ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ﴾ (حج۔۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدر جہا زیادہ ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اسی کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزاوسزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾ (نساء۔۱۳)

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورہ نساء کے اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا۔ اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی اَنی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (حجرات۔۲)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔

﴿ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

پھر جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں:

۱۔ جب جہاد کے معنی محنت، سعی، بلیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ نے ان صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا ''تمہارا آنا مبارک،تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو'' کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔[۱] چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے''۔یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو، یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت بعض حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (عنکبوت۔۷)

اور جنہوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا(یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

اس پوری سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا،سورہ کے آغاز میں ہے:

﴿ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (عنکبوت۔۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے۔اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔یہی مجاہدہ کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے،سورہ حج میں ارشاد ہوا:

﴿ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (حج۔۱۰)

اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت،اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی،تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

۱۔ بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۸۵ حیدرآباد دکن۔

''یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا'' وہی جہاد اکبر ہے جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا۔ ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے [1] کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ﴿ المجاهد من جاهد نفسه ﴾ یعنی ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے''۔ صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟ عرض کیا جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ [2] یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے۔ دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے' تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل۔۱۶)
تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام ''جہاد بالقرآن'' ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (فرقان۔۵)
تو کافروں کا کہنا مان اور بذریعہ قرآن کے توان سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

''بذریعہ قرآن کے جہاد کر'' یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر' اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر ''بڑا جہاد'' اور بڑا زور کا مقابلہ فرمایا ہے' اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن پاک کی نظر میں کتنی ہے؟ علماء نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے' اور اس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے' امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے' اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے [3] ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل فہم' علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس

---

[1] بحوالہ کنز العمال' کتاب الایمان جلد' صفحہ ۳۹۔

[2] صحیح مسلم باب من يملك نفسه عند الغضب جلد ۲ صفحہ ۳۹۶ مصر۔

[3] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۹۔

راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

جہاد بالمال:

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں، اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں، اور انہیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (انفال۔۱۰)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ بہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (توبہ۔۲)

ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (حجرات۔۳)

مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔

﴿ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً ﴾ (نساء۔۱۳)

اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان

ہے، جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے، انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست　　　　گر زر طلبی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

(۴) جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ "تمہارا جہاد نیک حج ہے"[۱] کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟ عرض کی جی ہاں، فرمایا ﴿ففیهما فجاهد﴾ تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو،[۲] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ نے فرمایا:

﴿ ان من اعظم الجهاد کلمة عدل عند سلطان جائرٍ ﴾ (ترمذی ابواب الفتن)

ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

(۵) اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پرواہ ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا، اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخش دی جائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے، اسی لئے ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جارہی

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

[۲] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد۔

ہے خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جو اب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں ان کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم میں ہیں۔

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''شہید'' ہے یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہیں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے [1] اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (آل عمران۔۱۴) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گواپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا وہ بھی اپنے حسن نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے ''غازی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (نساء۔۱۰)

اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے پھر وہ یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آل عمران۔۲۰)

تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بےخوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بے تاب نظر آتا ہے یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ ''مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں'' [2] ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے حق کی راہ میں میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے پھر مارا جاؤں پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد۔

[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد:

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے' مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آ سکتا ہے' اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر اُمتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت' علم دین کی اشاعت' حق کی نصرت' غریبوں کی مدد' زیردستوں کی امداد' سیہ کاروں کی ہدایت' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' اقامت عدل' ردِ ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے' یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے' سورہ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں، آخری آیت ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو' اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ' اور کام میں لگے رہو' اور خدا سے ڈرو' شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔

عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں' گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے' لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے' پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے' اس لئے تمام امور خیر' خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں' فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے' لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے' اصل یہ ہے کہ فقہاء نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے' اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے' پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی' اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے' اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنج گانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے' تقویٰ' اخلاص' توکل' صبر اور شکر ہیں' یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے' اور اسی لئے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جا سکتا ہے' یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں' جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنج گانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے' جسد بے روح بن جاتے ہیں' یہ بات گو یہاں بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے' کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لئے خلش ہو' یہ تقویٰ ہے' اور پھر کام کو خدائے واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے' یہ اخلاص ہے' پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے' یہ توکل ہے' اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے' اور خدا سے آس نہ توڑی جائے' اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے' یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے' اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے، یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے:

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں' اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے' قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں:

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ (بقرہ۔۱)

یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اسی تقویٰ کا حصول ہے:

﴿ يَاۤأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا' عبادت کرو' تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا' جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا' تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

حج کا منشا بھی یہی ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (حج۔۴)

اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان ومقامات) کی عزت کرتا ہے' تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (حج۔۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا' لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے' اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہئے:

﴿ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ ﴾ (توبہ۔۱۳)

جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ﴾ (توبہ۔۱۳) البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال ودولت اور ساز وسامان سے زیادہ تقویٰ ہے

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (بقرہ۔۲۵)

اور سفر میں زادِراہ لے کر چلو' اور سب سے اچھا زادراہ تقویٰ ہے۔

ہمارے زیب وزینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے۔

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ (اعراف۔۳)

اور تقویٰ کا لباس' وہ سب سے اچھا ہے۔

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿ وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ﴾ (بقرہ۔۳۱)

اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

﴿ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ﴾ (مائدہ۔۲)

انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (آل عمران۔۱۹)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔

﴿ وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ (بقرہ۔۲۸)

اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔

﴿ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ (نساء۔۱۹)

اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو' تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں!

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہیں:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴾ (دخان۔۳)

بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴾ (طور۔۱)

بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ (ذاریات۔۱)

شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴾ (قمر۔۱)

بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ (مرسلات۔۱)

بلاشک تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ (ن۔۲)

یقیناً تقویٰ والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴾ (نباء۔۲)

بے شبہ تقویٰ والوں کے لئے کامیابی ہے۔

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ (ص۔۴)

لاریب تقویٰ والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے:

گو بظاہر ابتداء میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں' یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے' ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے' اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت' عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی' لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے' اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بناء پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہئے' حالانکہ جو جتنا دور بین ہے' اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے' حقیقی دور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں' جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں' بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بناء پر کرتے ہیں' اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے' اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے' فرمایا

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ (اعراف۔۱۵)

اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ (ھود۔۴)

بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ (زخرف۔۳)

اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی ﴾ (طٰہٰ۔۸)

اور انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں:

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں' جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں' اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہردلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے' تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے' اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت' محبت اور ہردلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿ اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (انفال۔۴)

تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

﴿ فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (آل عمران۔۸)

تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (توبہ۔۱)

اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (جاثیہ۔۲)

اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں:

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت ومدد سے سرفراز ہوتے ہیں' اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے:

ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے' مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں' فرمایا:

﴿ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (مائدہ۔۵)

اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

اسی لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقاء' قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے' اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں؟

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے' اور دین ودنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں' یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے' چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورہ زمر میں ہے:

﴿ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ (زمر۔۴)

اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا' وہی لوگ ہیں تقویٰ والے' ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں' یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ' اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے' اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے' وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ' فوری ثمرہ' مال ودولت' اور جاہ وعزت کے نقطہ پر نہیں' بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے' اور

خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا' لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورہ بقرہ میں ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر' اور پچھلے دن پر' اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا' اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافر اور مانگنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا' اور نماز کو برپا کیا' اور زکوٰۃ ادا کی' اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں' اور سختی' تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں' یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ' بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا' اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے' عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے' پرہیز کرنے' اور لحاظ کرنے کے ہیں' لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے' جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے' دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے' یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے' قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (حج۔۴)

اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے' تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے' اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے' وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا' اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے' ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ (حجرات۔۱)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں' وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے' ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴾ (الشمس۔۱)

تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرتاً ودیعت ہیں اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾ (فتح۔۴)

اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی نادانی کی پچ تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

﴿ فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (توبہ۔۱)

تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (توبہ۔۲)

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

جس طرح انسان کا فجور بری تعلیم بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ ﴾ (محمد۔۲)

جو لوگ راہ پر آئے خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا۔

اس سے عیاں ہے کہ ''تقویٰ'' ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے صحابہ کے

مجمع میں ارشاد فرمایا:

﴿ التقوىٰ ھٰھُنا ﴾ (مسلم)

تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا' جس سے بے شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے جو تمام نیکیوں کی محرک ہے' اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے' یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت' ساری ربانی عبادتوں کا مقصد' اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار:

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے' اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل' رنگ' وطن' خاندان' دولت' حسب نسب' غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے' اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے' اور اس لیے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے' چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا:

﴿ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾ (حجرات۔۲)

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے' تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا' الکرم التقوىٰ یعنی بزرگی وشرافت تقویٰ کا نام ہے' اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عربی کو عجمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں' برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے"۔

اخلاص

﴿مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے' اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ' گوشت سے وابستہ ہے' عقائد ہوں یا عبادات' اخلاق ہوں یا معاملات' انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے' اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

﴿الا و انّ فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله ' الا و هی القلب﴾[1]

ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے' اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے' ہشیار رہو کہ وہ دل ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے' اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے' اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے' اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو' اور نہ اس سے مقصود ریا ونمائش' جلب منفعت' طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو' بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو' اسی کا نام اخلاص ہے' رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ط اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ﴾ (زمر۔۱)

تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گذاری کو اسی کے لیے' ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے خالص اطاعت گذاری۔

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے' وہ چیز خواہ پتھر' یا مٹی کی مورت' یا آسمان وزمین کی کوئی مخلوق' یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو' اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض وغایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے' فرمایا:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ﴾ (فرقان۔۴)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو' رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ (زمر۔۲)

کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کروں' اور مجھے حکم

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرء الدینہ' وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں' کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں' بڑے دن کے عذاب سے' کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ﴾

اطاعت گذاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو' یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی' اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو' اور ﴿ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰی ﴾ (لیل۔۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے' ہم جو کچھ کر رہے ہیں' اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں

﴿ وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ (شعراء۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰)

اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا' میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔

حضرت نوحؑ کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿ يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ﴾ (ھود۔۳)

اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں' میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔

خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا' میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا' اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے۔

﴿ قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَـكُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴾ (سبا۔۶)

کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے' میری اجرت تو اللہ پر ہے' وہ ہر بات پر گواہ ہے۔

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے' وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض' اور صرف خدا کے لیے ہے' دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى ﴾ (شوریٰ۔۳)

میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا' مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اس کے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں' اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو اور آپس میں محبت رکھو۔

اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

﴿ قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴾ (فرقان۔۵)

کہہ دے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا' مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے' کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے' لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش تھا' تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی' اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو' مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزدو اجرت اور تحسین وشہرت کی طلب سے بالاتر ہو۔ یہ تحسین وشہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے' جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں' ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے' دوسری روحانی' جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے' کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے' انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے' اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں' اس لیے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں' تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے' دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں' خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی' اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرمادیا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (مائدہ۔۵)

خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں' انہیں کا کام قبول ہوتا ہے' اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے' ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے' اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے' ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے' اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے' وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں' لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسل فیض یاب ہوتے ہیں' اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں' حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا' کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا' خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں' باطنی صورت کا فرق ہے' ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے' اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے' اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ (طہ۔۳)

اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے' اور موسیٰؑ کے معجزات نے ایک نئی قوم' ایک نئی شریعت' ایک نئی زندگی' ایک نئی سلطنت پیدا کی' جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے' اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے' اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

﴿فَتَوَكَّلُ عَلَى اللّٰهِ﴾ (آل عمران۔۱۷)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدو جہد اور کوشش نہ کی جائے' بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے' اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دے گا' یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا' اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں' لیکن یہ سراسر وہم ہے' اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے' جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں' اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں' لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا؟ کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل' اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے' حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدو جہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا' تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا' اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے کے لیے جدو جہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا' اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا' نہ بدر و اُحد' اور خندق و حنین میں سواروں' تیر اندازوں' زرہ پوشوں' اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی' اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے' حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو' مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو' اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو' اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا' اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو' اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو' اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدو جہد کا نتیجہ اور اثر ہے' بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا' اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا' آل عمران میں ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (آل عمران۔۱۷)

اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو' پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو' بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے' اگر اللہ تمہارا مددگار رہو تو کوئی تم پر غالب نہ آ سکے گا' اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے' اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی' کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے' تو کوئی ہم کو نا کام نہیں کر سکتا' اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش ومدد کار آمد نہیں ہو سکتی' اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں' حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو' اور خدا پر بھروسہ رکھو' وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا۔

﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ (نساء۔۱۱)

تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے' تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے' اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ٥ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ٥ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ٥ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر' اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا' پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں' اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے' اور نمازیوں میں تیری آمد ورفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے' یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی' مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے' احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے' وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ٥ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ (احزاب۔۱)

اے پیغمبر خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہا نہ مان' بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے' اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے' اس کے پیچھے چل' بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے' اور اللہ پر بھروسہ رکھ' اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ' اور مصالحت کر لو' اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکا نہ دیں' خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ

کامیاب نہ ہوگا۔

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (انفال۔۸)

اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں، تو تو بھی جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے۔

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴾ (نمل۔۶)

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں، اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا، اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ (فرقان۔۵)

اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا بااختیار نہیں۔

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ (توبہ۔۱۶)

تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہئے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے۔

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ (شوریٰ۔۲)

اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔

﴿ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ (رعد۔۴)

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکیں' تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے' اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں' کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی' اسی پر میں نے بھروسہ کیا' اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے' اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہیے' کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے:

﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (الملک۔۲)

کہہ دے وہی رحم والا ہے' ہم اس پر ایمان لائے' اور اسی پر بھروسہ کیا' تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں' مخالفتوں' اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے' آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے' اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے' حضرت نوحؑ جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴾ (یونس۔۸)

(اے پیغمبر!) ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا' اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کرلیا ہے' تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کرلو پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے' پھر اس کو مجھ پر پورا کرلو' اور مجھے مہلت نہ دو۔

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنوں کے ہر قسم کے مکروفریب' سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہیں' حضرت ہودؑ کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے' تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۙ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَي اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ ﴾ (ھود۔۵)

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں' اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو' پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو' پھر مجھے مہلت نہ دو' میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ کرلیا ہے۔

حضرت شعیبؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروانہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے۔

﴿ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ﴾ (ھود۔۸)

میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کی مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے:

﴿ قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ ۙ وَانۡتَظِرُوۡا ۚ اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ۙ وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِلَيۡهِ يُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ كُلُّهٗ فَاعۡبُدۡهُ وَتَوَكَّلۡ عَلَيۡهِ ﴾ (ھود۔۱۰)

کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید، اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے، اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی۔

﴿ قَدۡ كَانَتۡ لَـكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِيۡمَ لِاَبِيۡهِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَاِلَيۡكَ اَنَـبۡنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴾ (ممتحنہ۔۱)

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا، اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت یعقوبؑ اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لیے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

﴿ وَقَالَ يٰبَنِىَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغۡنِىۡ عَنۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ۚ وَعَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴾ (یوسف۔۸)

اور (یعقوب نے) کہا‘ اے میرے بیٹو‘ ایک دروازہ سے نہ جانا‘ بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا‘ اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا‘ فیصلہ اسی کا ہے‘ اسی پر میں نے بھروسہ کیا‘ اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

حضرت یعقوبؑ کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ظاہری تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیبؑ کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے‘ ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے‘ تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

﴿ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ط عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴾ (اعراف۔۱۱)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا‘ اور یہ ہم سے نہیں ہوسکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں‘ مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے‘ ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے‘ ہم نے خدا پر بھروسہ کیا‘ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کردے‘ اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور وقوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی‘ فرمایا:

﴿ يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴾ (یونس۔۸)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو‘ تو اسی پر بھروسہ کرو‘ اگر تم فرمانبردار ہو۔

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

﴿ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (یونس۔۹)

ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا‘ ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا‘ اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا‘ اس سے ہر شخص واقف ہے‘ یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ (طلاق۔۱)

جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے‘ کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا‘ اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

ع خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں، وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پرزور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو [1] اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے۔

ع برتوکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی [2] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں [3] ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ''جو دغواتے اور تعویذ گنڈا کراتے ہیں، وہ توکل سے محروم [4] ہیں''۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں'' [5] اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا

---

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلها و توکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ صفحہ ۴۱۴) میں اور قیده و توکل شعب الایمان بیہقی میں اور قیدها و توکل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۳ حیدر آباد)۔

[2] شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔

[3] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق، و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔

[4] جامع ترمذی باب ماجاء فی کراہۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہیں، من اکتوی او استرقی فهو بری من التوکل

[5] جامع ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۳۸۸ و حاکم۔

ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ:

﴿ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا ﴾ (هود۔۱)

زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لیے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے، اور نہ ان کو دل تنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۙ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًا ﴾ (طلاق۔۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا، اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ''خود اعتمادی'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے ''خدا اعتمادی'' کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

صبر

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (احقاف۔۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتو پردے ڈال رکھے ہیں' وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے' اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں' لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی:

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارے'' کے ہیں' یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا' اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا' اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے' یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں' بلکہ پامردی' دل کی مضبوطی' اور اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں' حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے' اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں' حضرت خضرؑ کہتے ہیں:

﴿ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴾ (کہف۔۹)

تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے' اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو' جس کا علم تمہیں نہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا ﴾ (کہف۔۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود' پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں' تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ﴾ (فرقان۔۴)

یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا' اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ﴾ (حجرات۔۱)

اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے' گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے' بایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے' یعنی ثابت قدمی اور استقامت' صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے' حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا:

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اور اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ (طور۔۲)

(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

﴿ فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ﴾ (اعراف۔۱۱)

تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔

﴿ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴾ (یونس۔۱۱)

اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔

﴿ فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (ھود۔۴)

ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہئے۔

﴿ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ﴾ (روم۔۶، مومن ۶ و ۸)

ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴾ (دھر۔۲)

اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین میں) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہنا مان لے۔

آنحضرتؐ کو حضرت یونسؑ کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لیے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے۔

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ﴾ (ن-۲)

اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر' اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔

بیقرار نہ ہونا:

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو' بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے' اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا' اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی:

﴿ وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ ﴾ (حج-۵)

اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

حضرت یعقوبؑ بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسفؑ کو کھالیا' فرماتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴾ (یوسف-۲)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے' تو بہتر صبر ہے' اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ﴾ (یوسف-۱۰)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے' تو بہتر صبر ہے' عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوبؑ نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا' اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

﴿ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴾ (ص-۳)

ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا' کیسا اچھا بندہ' وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔

حضرت اسماعیلؑ اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴾ (صافات-۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے' وہ کر گذر' خدا نے چاہا تو تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا:

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں' دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں' اور مخالفین جو طعن و طنز کریں' ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے' اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے' اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو' بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے' مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے' آنحضرت ﷺ کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا' تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ .... وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ ﴾ (مدثر۔۱)

اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر...... اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے' چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا۔

﴿ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّھُمْ ﴾ (احقاف۔۴)

(اے محمد ﷺ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی' اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر۔

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (لقمان۔۲)

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے' اس کو برداشت کر' یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے' یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے' حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروانہ کر' اور نہ ان سے دل کو اداس کر' بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ' اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا۔

﴿ اِصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ﴾ (ص۔۲)

ان کے کہے پر صبر کر' اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے' اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ ﴾ (طٰہٰ۔۸وق۔۳)

تو ان کے کہنے پر صبر کر' اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن وطنز کا دھیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مروت برتا جائے' فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا ﴾ (مزمل۔۱)

تو ان کے کہے پر صبر کر' اور ان سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔

درگذر کرنا:

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز' اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے' اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے' ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا

صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی، اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کر، اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد۔۳)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

فرشتے ان کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد۔۳)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا، اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا۔

﴿ وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ (فصلت۔۵)

بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہوگا، اس لیے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کر دے، فرمایا:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (شوری۔۴)

راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پردرد عذاب

ہے اور البتہ جس نے برداشت کیا اور بخش دیا' بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی:

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے' قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے' اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے' صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے' کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا' فرمایا:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

اور صبر کرنے والے' ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت' وہی ہیں جو سچ بولے اور وہی پرہیز گار ہیں۔

اگر لڑائی آ پڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں' خدا کی یاد' امام وقت کی اطاعت' آپس میں اتحاد و موافقت' اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (انفال۔۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو' تاکہ فلاح پاؤ' اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو' اور آپس میں جھگڑو نہیں' ورنہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی' اور صبر دکھاؤ' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے' تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے' اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثاروں کو سکھا دیا تھا' جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (انفال۔۹)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار، اگر بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے' اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے' کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں' اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی' اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے' تو اگر سو صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے' اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروانہ کریں اور صبر وثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (بقرہ ۔۳۳)

طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر وثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔

اللہ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا کہ خدا انہیں کا ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ﴾ (نحل ۔۱۴)

پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا پھر لڑتے رہے اور صبر وثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت وحکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر واستقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آ پڑا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

﴿ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (اعراف ۔۱۵)

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر واستقامت سے کام لو بے شک زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل مصروشام وکنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہو گئیں اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خودمختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے فرمایا:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ

وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُوْنَ ﴾ (اعراف۔۱۶)

اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر وثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سربلند ہوئی کہ اس نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۳)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں ایک احکام الٰہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثباتِ قدم یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی رُوداد ان کو سناتا ہے۔

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن توبرتو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگذر کا نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت وہمت کی بلندی عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو

دو باتوں کی تاکید فرمائی' ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر واستقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے' انہیں کے حصہ میں ہے جن کو یہ پامردی' دل کی مضبوطی' اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی' حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے' اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں' چنانچہ فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے' اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس:

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں' اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے' مگر یہی نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے' اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی' متانت' وقار' اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم ومسرت اور رنج وراحت توام ہیں' ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے' یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر وغرور پیدا نہ ہو' اور غم وتکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو' دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر وثبات اور ضبط نفس ہے' انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ (ھود۔۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں' پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے' اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں' تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں' بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے' لیکن وہ جنہوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے' یہ لوگ ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا:

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی سے بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے' اسی لیے مذہبی فرائض واحکام کو جو بہرحال نفس پر سخت گذرتے ہیں' عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے' ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے' اسی لیے حکم ہوا:

﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ﴾ (مریم۔۴)

آسمانوں کا پروردگار' اور زمین کا' اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا' تو اس کی بندگی کر' اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (طہ۔۸)

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر' اور آپ اس پر قائم رہ۔

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے' وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے' اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے:

﴿ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًاo وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴾ (دھر۔۱)

تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچالیا اور ان کو تر وتازگی وشادمانی سے ملایا' اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں' ایمان لائیں' نیک کام کریں' فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں' بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں' اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں' ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (فرقان۔۶)

ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر' خلاف طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے' اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے' بچتے رہے' راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا' صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا' الوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا' تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا' قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام وراحت جان کر جھیل لینا' سود کی دولت سے ہاتھ اٹھالینا' حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا' غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے' اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیات پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے' جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿ حُجِبَتُ (حُفَّت) الجنّة بالمكاره وَحُجِبَتُ (حُفَّتِ) لنّارُ بالشّهواتِ ﴾ (صحیح بخاری کتاب الرقاق وصحیح

مسلم' کتاب الجنۃ)

جنت ناخوشی کے کاموں' اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے' اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے' اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں' اور اس عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے' کسی قارون کے خزانہ' مال و دولت کی فراوانی' اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مال حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مال حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لے' تو یہ بڑی قوت کا کام ہے' جو صرف صابروں کو ملی ہے

حضرت موسٰیؑ کے زمانہ میں جو قارون تھا' اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے' لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی' اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے' خدا کی وہ دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملے گی' وہ لازوال' غیر فانی اور جاودانی ہے۔

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴾ (قصص۔۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا' وہ بڑا خوش قسمت ہے' اور جنہیں علم ملا تھا' انہوں نے کہا' تمہارا بُرا ہے اللہ کی جزا ان کے لیے جو ایمان لایا اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے' اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے۔

﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَّلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۳)

جو تمہارے پاس ہے' وہ چک جائے گا' اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے' اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو' کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں' اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے' اس کے بعد ہے:

﴿ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (ھود۔۱۰)

اور صبر کر' کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

صبر کے فضائل اور انعامات:

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (زمر-۲۰)
صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے۔

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظَاتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (احزاب-۵)
بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴾ (آل عمران-۲)
(جنت اور خدا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لا چکے ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے ہیں جس میں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتح مشکلات کی کنجی صبر و دعا:

بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے' دعا اور صبر' اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں' یہود جو آنحضرت ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے' اس کے دو سبب تھے' ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا' اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں' یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر' ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے' اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا۔

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (بقرہ۔۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔

دعا سے ان کے دل میں اثر' اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا' اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی' ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں' اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو' بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے' اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں' ان کو مردہ نہ کہو' بلکہ زندہ ہیں' لیکن تم کو خبر نہیں' اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ' اور بھوک' اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے' اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوشخبری سنا دو' جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں' اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے' یہ لوگ ہیں' ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں' اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے' جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر' ضبط نفس' اور ثابت قدمی سے برداشت کریں' اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں' آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی' اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے' اگر اس راہ میں موت بھی آ جائے تو وہ حیات جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

﴿ وَ كُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴾ (اعراف۔۱۷)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ''جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے''۔اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے' یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہوسکتی ہے۔دل سے،زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے،یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو۔زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے۔خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹ کفر ہے۔اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار'اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں'اسی سے ہماری زبان میں ''کفران نعمت'' کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا،زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے'قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں۔

﴿ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ﴾ (دھر۔۱)

ہم نے انسان کو راستہ بتادیا (اب وہ) یا شکر گذار (شاکر) ہوا یا ناشکرا (کافر) ہوگیا۔

﴿ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ ﴾ (ابراہیم۔۲)

اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے'حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے۔

﴿ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا وَّلَمۡ يَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ ؕ اِجۡتَبٰهُ وَهَدٰٮهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴾ (نحل۔۱۶)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ

تھا۔ اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گذار اللہ نے اس کو چن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے احکام الٰہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان' ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا۔

﴿ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ ﴾ (اعراف۔۲)

تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

﴿ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے۔

﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ (زمر۔۷)

بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گذاروں میں سے ہو۔

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں' کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں' کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے۔ جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورہ فاتحہ ہے سورہ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورہ فاتحہ سے اور سورہ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (فاتحہ-۱)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں' سب کی پرورش اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں اس لیے حمد اسی ایک کی ہے یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا۔یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت' جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے وہ' وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا۔اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی۔

﴿ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (زمر-۸)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے۔

﴿ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (روم-۲)

اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ (مومن-۱)

جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے چاروں طرف ہیں وہ اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اسی کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے۔

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (بنی اسرائیل-۵)

اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے۔

﴿ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ (حجر' طٰہٰ' مومن' طور' فرقان)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں۔مثلاً کھانا کھانے کی' نئے کپڑے پہننے کی' سونے کی' سو کر جاگنے کی' نئے پھل کھانے کی' مسجد میں جانے کی' طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں ان کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں

کی تعمیل میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں مثلاً جو اپاہج اور معذور ہوں بیمار ہوں کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے پیاسوں کو پانی پلایا جائے۔ ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے۔

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴾ (فرقان۔۶)

بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے۔ یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرق ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے۔

﴿.... الرَّحِيْمُ الَّذِىْ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی پھر اس کی اولاد کو بے قدر نچڑے ہوئے پانی سے بنایا پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو۔

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۱)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے۔ یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا۔ وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے۔

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (حج۔۵)

تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے اسی

طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیئے ہیں تاکہ تم شکر کرو۔

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو۔ اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰؑ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے۔

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ﴾ (قصص۔۸)

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابلِ ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے' ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (حدید۔۲)

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (حدید۔۲ مزمل۔۲)

اور خدا کو قرض حسنہ دو۔

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (تغابن۔۲)

اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا۔

''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی' بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو' تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا' فرمائے گا کہ تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی پرسش نہ کی اور اگر کرتا تو' تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا' اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا' بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار تو' تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا' فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا' اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو' تو نے مجھے پانی نہیں پلایا' بندہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو' تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا' فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا' اگر تو اس کو

پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔[1]

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کر اتارنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل وکرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ ملا اس کے فضل وکرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں دیکھ کر اوران کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں۔ بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بارآور بنائے۔

دولت ونعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم وہنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا یہی غرور ہے جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ (حدید۔۳)

(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا جو خود کنجوس ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن وخوبی) سے مالا مال ہے۔

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔

خدا نے انسانوں پر جو تو برتو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے‘ اس کے مرتبہ کو جانے‘ اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت وبخشش کا مناسب شکر اپنے جان ومال ودل سے ادا کرے۔

﴿ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (انفال۔۳)

اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دی تاکہ تم شکر کرو۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (نحل۔۲)

اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور تا کہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تا کہ تم شکر کرو۔

﴿ وَكَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (حج۔۵)

اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو۔

﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (قصص۔۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل و کرم کی تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ (یونس۔۶)

اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (اعراف۔۱)

اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اور اس میں تمہارے لیے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا۔

﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴾ (عبس۔۱)

مارے جائیو انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا تو مالک کا شکر ادا ہو گیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ (سبا۔۲)

اے داؤد کے گھر والو شکر ادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو۔

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ اسی لیے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں۔

﴿ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰهُ ﴾ (نمل۔۲)

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے' شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو۔

اس دعا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے میں ان کے لیے اپنے نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو کوئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں' اسی لیے فرمایا۔

﴿ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَلَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ ﴾ (ابراہیم۔۲)

اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا' اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔

﴿ کَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ شَکَرَ ﴾ (قمر۔۲)

ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔

﴿ وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ ﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے' ارشاد ہوا۔

﴿ مَنۡ لَّا یَشۡکُرِ النَّاسَ لَا یَشۡکُرُ اللّٰهَ ﴾ (ترمذی کتاب البر والصلۃ)

یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا۔

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا' تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی' ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں ان تعلیمات کے ایک ایک آیت حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزء ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی۔ عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ ﷺ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے۔ عملاً صاف واضح اور متعین ہے اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے' نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہوسکتا۔

﴿ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَبَرَكَاتُهُ ﴾

مغفرت کا طلبگار

سید سلیمان ندوی

۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ

حصّہ ششم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿الحمد للّٰہ الذی انزل الکتاب و الحکمۃ و الصّلوٰۃ و السّلام علٰی رسولہ نبی الرحمۃ﴾

وعلٰی الہ و اصحابہٖ اولی العزم و الھمۃ

اے تو ہمیں صفت سزاوار	نامِ تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ زگنج خانۂ راز	بر آدمیاں در سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد	حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆☆☆☆☆☆☆

در قربت حضرت مقدس	پیغمبر پاک، رہبرم بس
گنجینہ کیمیائے عالم	پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریر پادشاہی	توقیع سپیدی و سیاہی (خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں' یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے' عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور' اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ ''اسمائے حسنیٰ'' کا پرتو ہیں بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق' خالق کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے' بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں' جیسے اللہ کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر اللہ کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں حالانکہ حقیقی صفتِ علم اللہ میں ہے' بندہ میں نہیں' لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ [1] ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں' یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے' اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک' اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (شوریٰ: ۲)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ' ص ۲۴۔ مطبوعہ مدینہ بجنور

حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں' یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں' ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو رّبانی تعلیم آئی وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرما دی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے ایسے موقع پر اگر شک وشبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں۔ پھر حقوق' فضائل' رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل' رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں' جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گذار ہوں۔

آیات واحادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح وحکم کی تشریح میں اپنے ذوق وفکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو وخطا انسان کی فطرت ہے' پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر وذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزاء پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں (رحمہ اللہ تعالیٰ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین وآرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان وعبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق وعادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

(۴ رذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ﴾

تعلیمات نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے‘ اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق وفرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے‘ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے‘ اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے‘ اس کے اپنے ماں باپ‘ اہل وعیال‘ عزیز ورشتہ دار‘ دوست واحباب‘ سب سے تعلقات ہیں‘ بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ‘ وطن‘ قومیت‘ جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے‘ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں‘ اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی‘ خوشحالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے‘ اسی دولت کی کمی کو حکومت وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے‘ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو‘ اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے‘ دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے‘ اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے‘ آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے‘ اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے‘ اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے' چنانچہ اس عرصہ ہستی میں جس قدر پیغمبرؑ اور مصلح آئے' سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے' انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے' خیرات نیکی اور چوری بدی ہے' لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے' خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ ﴾ (موطا مالک حسن اخلاق)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالکؒ کی موطا کی روایت ہے' مسند احمد' بیہقی اور ابن سعد[1] وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ﴾ [2]

میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا' ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا' انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:

﴿ رَاَيْتُهٗ يَاْمُرُ بِمَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ ﴾

میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے' بتوں کو پوجتے تھے' مردار کھاتے تھے' بدکاریاں کرتے تھے' ہمسایوں کو ستاتے تھے' بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا' زبردست' زیردستوں کو کھا جاتے تھے' اس اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں' سچ بولیں' خونریزی سے باز آئیں' یتیموں کا مال نہ کھائیں' ہمسایوں کو آرام دیں' عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں'' [3]

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے' آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاکدامنی اختیار کریں' سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں'' [4]

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبع کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ۔

[2] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲' صفحہ ۳۴۹ مصر۔

[3] ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدر آباد' جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت۔

[4] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد ۱۲۱۔

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

﴿ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۶۲:۲)

یہ پیغمبران ان پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا' اوران کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے (جمعہ۔۱)

اس آیت میں دولفظ فیصلہ کے قابل ہیں ایک پاک وصاف کرنا' جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت

ا۔تزکیہ:

کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا' نکھارنا' میل کچیل دور کرنا ہیں' قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے' یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کردی جائے' سورہ والشمس میں ہے۔

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴾ (شمس)

قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا' پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کردی' بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا' اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ (اعلیٰ)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴾ (عبس)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا' کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا' اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا' یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے' جس کو اس نے پیغمبر اسلامؐ کی خاص خصوصیت قرار دی ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو جلا دیں' ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں' اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں' چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔حکمت:

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جاچکی ہے' مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے' جو نور الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے' اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و

احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم وعرفان کے ان عملی آثار ونتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون سی باتیں داخل ہیں، سورہ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت وتعظیم، قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے۔

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ (الاسرآء)

یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورہ لقمان میں ہے کہ

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ﴾ (لقمان-۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ اللہ کا شکر ادا کر۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ ''کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ، اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔'' ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے، اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں، ''حکمت'' کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحی محمدی کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (الحج-۱)

اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوت محمدی کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا، اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوق عباد کی اہمیت:

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے، اور عبادات حقوق اللہ یعنی اللہ کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے، اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور

تقصیر کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو' اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہوسکتی' جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو' تو اس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے' ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا' صرف اعمال ہوں گے' ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی' اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامہ اعمال کی تین فردیں ہوں گی' ایک وہ جس کی کوئی پروا اللہ نہ کرے گا' دوسری وہ جس میں سے اللہ ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا' اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا' جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے' اور جس فرد کی کوئی پرواہ اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے' جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے اللہ کے درمیان ہے' جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو' تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کردے گا' اور بخش دے گا' لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے"۔ (مسند احمد و حاکم عن عائشہؓ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا' اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟[2] چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے' جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے' اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے' جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا' جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہولیا۔

اسلام کے ارکان پنج گانہ اور اخلاق:

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے' بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے' اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہوگیا ہے' حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے' قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے' چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے' روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے' زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے' اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں' مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے' اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں' وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں' وہ پھول ہیں جن

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷

[2] یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم۔

میں خوشبو نہیں، اور وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیم نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''اللہ فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو، اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو، اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ ''نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے، اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ''اے میرے اللہ''! جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے، اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں، جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا، اور بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے۔'' اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز اسی لیے فرض کی گئی، اور اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ اللہ کی یاد کی جائے۔'' تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو جو مقصود ہے، تو اس یاد الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور دور کر دیتی ہے۔'' [۱]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے، اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ''جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہیں'' [۲] اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' [۳] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاق حسنہ اور ایمان:

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں، اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنوں میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ـــــ وَالَّذِيْنَ

[۱] جلد اول باب فضیلۃ الخشوع۔

[۲] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ۔

[۳] صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ، کتاب الصوم۔

هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (مومنون۔۱)

بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع وخشوع کرتے ہیں' اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے' اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں' اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔۔۔اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں' اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے' ان میں وقار وتمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ اور تقویٰ:

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے' تقویٰ ہے' وحی محمدی نے تصریح کردی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں۔

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر' قیامت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا' اور مال کی خواہش کے باوجود (یا اللہ کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو' یتیموں کو' غریبوں کو' مسافر کو' مانگنے والوں کو' اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا' اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا' اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں' اور جو مصیبت' تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں' وہی ہیں جو راست باز ہیں' اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راست بازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے' اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی' ایفائے عہد اور صبر وثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاق حسنہ اور اللہ کے نیک بندہ ہونے کا شرف:

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں' اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں' چنانچہ سورہ فرقان میں ارشاد ہوا۔

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا

وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ ــــــــــ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ (فرقان۔۲)

اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں' جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں' اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں' اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گذارتے ہیں' اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر' کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے' اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے' اور جو خرچ جب کرتے ہیں' تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں' بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گذریں' اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے' اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے' جس کو اللہ نے منع کیا ہے' اور نہ بدکاری کرتے ہیں' کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔۔۔۔۔۔اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے' اور جب کسی لغو بات پر سے گذرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں' اور جب اللہ کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں' اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش' اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگذر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکر و زور میں شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف:

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں۔

﴿ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (شوریٰ۔۴)

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں' اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں' اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں' اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں' نماز ادا کرتے ہیں' اور ان

کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں' اور ہم نے ان کو جو دیا ہے' اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں' اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں' اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' تو جو کوئی معاف کر دے' اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے' وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا' اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں' ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں' اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں' ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے' اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران ۱۴)

جنت ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے' جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں' اور جو غصہ کو دباتے ہیں' اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ (قصص ۶)

یہ وہ ہیں جن کو دہرا ثواب ملے گا اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا' اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں' اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے' تم سلامت رہو ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔

﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ (دہر)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین' یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی' وہ احادیث میں محفوظ ہے' ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں' تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں:

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے' وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے' اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

﴿ واهدنی لا حسن الاخلاق لا يهدی لا حسنها الا انت واصرف عنی سيئاتها لا يصرف عنی سيئاتها الا انت ﴾ (مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)

اور اے میرے اللہ تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر' تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا' اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا لیکن تو۔

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہ الٰہی

سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا۔

﴿اکمل المومنین ایماناً احسنھم خلقاً﴾

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے، کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا۔

﴿ان الرجل لیدرك بحسن خلق درجة قائم اللیل و صائم النهار﴾

انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسن خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا

﴿خیارکم احسنکم اخلاقا﴾ (بخاری کتاب الادب)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

﴿مامن شئی یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم و الصلوٰة﴾

(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں، اس حدیث نبوی نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو اللہ کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

﴿خیر ما اعطی الناس خلق حسن﴾

لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے، اس بشارت نے اخلاق حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا

﴿ احب عباداللّٰہ الی اللّٰہ احسنھم اخلاقاً ﴾ (طبرانی)

اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا

﴿ ان احبّکم الیّ و اقربکم منی فی الاٰخرۃ مجالس محاسنکم اخلاقاً و ان ابغضکم الیّ و ابعدکم منیّ فی الاٰخرۃ مساویکم اخلاقاً ﴾ (ابن حنبل وطبرانی وابن حبان وشعب الایمان بیہقی)[۱]

تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں، اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک صحابی کی دو بیویاں تھیں، ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں، اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی اس بدخلقی کی سزا بھگتے گی" اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی۔"[۲] ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلامؐ کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا، اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا، اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک۔"[۳] غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم:

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشاء میں زیادتی و کمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیرِ دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

---

[۱] یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی، کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں۔

[۲] ادب المفرد، امام بخاری باب من لا یوذی جارہ۔

[۳] مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ صفحہ ۴، حیدر آباد دکن۔

۱۔ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲۔ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے‘اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف دہ کی چیز کو ہٹا دو (تا کہ تمھارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳۔جس میں تین باتیں ہوں‘اس نے ایمان کا مزہ پایا‘ جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو‘ جو دوسرے سے صرف اللہ کے لیے پیار کرے‘اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔جس میں یہ تین باتیں ہوں‘اس نے ایمان کا مزہ پایا‘ حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا‘ مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا‘اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔تین باتیں ایمان کا جز ہیں‘ مفلسی میں بھی اللہ کی راہ میں دینا‘ دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا‘اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے‘ جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

۷۔مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں‘اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں۔

۸۔ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یارسول اللہ ﷺ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا)

۹۔ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا‘ پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماحت)

۱۰۔مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے‘اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا‘اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے‘ اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱۔مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے‘ نہ کسی کو بددعا دیتا ہے‘اور نہ گالی دیتا ہے‘اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے‘ نہ اس پر وہ ظلم کرے‘اور نہ اس کو گالی دے‘ جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا‘ اللہ اس کی مدد میں ہوگا‘ جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا‘ تو اللہ اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳۔مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں‘ مسلم وہ ہیں جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں‘ مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے‘اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا‘ جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴۔جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵۔بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہیں‘ بولے تو جھوٹ بولے‘ وعدہ کرے تو خلاف کرے‘ اس کو امانت

سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ [۱]

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پرغور کرنا چاہئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاق حسنہ صفات الٰہی کا سایہ ہیں:

لیکن اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ درحقیقت صفات الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں، اور اسی کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے، ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں، اور انہی کو برا کہتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پرجلال صفتیں بھی ہیں جو صرف اللہ ہی کو زیبا ہیں، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کے مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، اللہ کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو، اور اللہ کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، [۲] اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[۱] یہ تمام حدیثیں معتبر ومستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور ومعتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

[۲] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴، ۴۰۵۔

اخلاقی مُعلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہہ کیا' اور آداب و اخلاق کے وہ سبق اس سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں' اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفہ تعلیم کا ایک ورق ہے' مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے' اور ان میں درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے نوع انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں' ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی' جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی' دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی' ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور مصلحین دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں' ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے' پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکم خداوندی" کو قرار دیا' اس حکم و فرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں' نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے' نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے' اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے' دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق' نفسیاتی خواص کی بحث' اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین' قوائے عملی کی تحدید یہ سب کچھ ہے' مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے' اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یار ما ایں وار دو آں نیز ھم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی' فرمان الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری' امر ربانی اور حکم فطرت' کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انبیاء اور حکما میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کے مقدس کارنامے' اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں' جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے' اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے' لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے' اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ' باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے' عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی' وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے' مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا' وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے' مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے' وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے' مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا' وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے' مگر وہ خود سچا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے' دل اور ہاتھ نہیں' اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی' بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے' اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ

کہتے ہیں وہ کرتے ہیں' جوان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے' جوان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے' اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اثر کرتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے' یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکما' یعنی موسیٰؑ عیسیٰؑ' محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط' افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے' سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا' مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ' عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں' اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے' وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں' بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں' ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو' تا کہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق' اور اہل صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں' اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں' تا کہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں' الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

(۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی:

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلامؐ کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں' دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے' توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں' ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے' اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے' حضرت نوح سے لے کر حضرت موسیٰ علیہم السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ' ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں' اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس (۳۳) برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے' ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاق زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیان مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ "یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جس میں محمد کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے"[1] آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمان راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو ﴿الا فلیبلغ الشاهد الغائب﴾

قول کے ساتھ عمل:

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راستبازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں، اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "سب کچھ جو تمھارے پاس ہے جب تک اس کو اللہ کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے"[2] کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریروں کا مقابلہ نہ کرو" کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنوں کو بھی پیار کرو" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمھارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمھارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (بقرہ۔۵) (کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ o كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (صف) (تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے

[1] باسورتھ سمتھ کی کتاب سیرت محمدی ص ۱۰۸۔

[2] انجیل۔

اللہ کے یہاں کہو وہ جو نہ کرو)

ایک شخص نے آ کرام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا کان خلقه القران [1] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا' اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا' تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا' خود بھوکے رہے' اور دوسروں کو کھلایا' اگر آپ ﷺ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا' کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا' اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا' جنھوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں' مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا' کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا' خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی' سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں' الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں' اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں' اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں' دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا' لیکن محمد رسول اللہ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا، فرمایا

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (یونس۔۲)

(اے منکرو) میں تو تمھارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا۔

﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (ن۔۱)

(اے محمد) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل:

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے' یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو' وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو' اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے' کیا اس میں جن کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے' یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفہ وحی نے بار بار اعلان کیا

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (جمعہ۔۶۲:۲)

---

[1] ابوداؤد' باب صلوٰۃ اللیل۔

وہ ان کو اللہ کی باتیں سناتا' اور ان کو پاک وصاف بناتا' اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے

اس تحدّی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے' کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا' اور اللہ کے احکام سناتا ہے' بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف و مصفیٰ بنا بھی دیتا ہے' وہ ناقصوں کو کامل' گنہگاروں کو نیک' اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے' چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا' کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے' اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا' تئیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاق کا تنوع:

اگر کسی معلّم میں تکمیل کی یہ تاثیر ہو' پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں' بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے' اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں' حضرت موسیٰؑ کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں' حضرت عیسیٰؑ کے مکتب میں عفوودرگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں' بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں' لیکن محمد رسول اللہ کی درسگاہ اعظم میں آ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے' جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے' خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے' جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے' اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں' اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان' ایک باپ' ایک شوہر' ایک دوست' ایک خانہ دار' ایک کاروباری تاجر' ایک افسر' ایک حاکم' ایک قاضی' ایک سپہ سالار' ایک بادشاہ' ایک استاذ' ایک واعظ' ایک مرشد' ایک زاہد وعابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے' یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوے ادب تہہ کرتے ہیں' اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں' مدینۃ النبی کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی تھا' اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں' کہیں ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ جیسے فرمانرواز یر تعلیم ہیں' کہیں طلحہؓ وزبیرؓ ومعاویہؓ وسعدؓ بن معاذ وسعدؓ بن عبادہ جیسے ارباب رائے وتدبیر ہیں' کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں' کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران' عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے' کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے' جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ وسلمانؓ وابودرداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے' کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گذارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے' کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے فقیہ ومحدث تھے' جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا' ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے' تو دوسری جگہ آقاؤں کی

محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ [1]

[1] اس موقع پر مدراس والے کو میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل وتشریح کے لیے ہم کوتھوڑی دیر کے لیے فلسفہ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا' اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے' جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی وجسمانی اعمال کا وجود ہے' مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث' ان کے اسباب وعلل کی تلاش' ان کے اصول وقوانین کی تحقیق' اور ان کی غرض وغایت کی تعیین' یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی' اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی' ان اسباب وعلل' اصول وقوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے' ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریئے بنتے اور بگڑتے رہے' اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے' اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں' جنھیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذتیہ'' کہا گیا ہے' موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے' یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہئے' پہلا فریق اخلاق کی بنا ''جذبات'' پر قرار دیتا ہے' اور دوسرا ''عقل'' پر پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے' ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مآخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں' علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون' اللہ کا قانون' فطرت کا قانون' حاسۂ اخلاق کی آواز' ضمیر کا قانون' وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے' لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں' یعنی یہ کہ یہ قوانین اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے' جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لا سکے' انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا' پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا' اور کسی نے اس سے باہر' جنھوں نے خود انسان کے وجدان کو' انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا' جنھوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا' انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا' مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم' یا بادشاہ کا حکم' یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا' ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا' جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ اللہ کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو' لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے' اور اپنے بندوں کی فطرت میں بھی ودیعت رکھا ہے' تا کہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے' فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریئے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں' ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ اللہ کا حکم ہونے کے ساتھ اس

کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں، اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو، اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد اللہ کا حکم بھی ہے، اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے، اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے، اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہوسکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو، اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض اللہ کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہئے، وجدان کہئے، حاسہ اخلاقی کہئے، ضمیر کہئے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں، اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے، کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب وہوا، خصوصیات اقلیم، زبان، مذہب، رسم ورواج، طرز حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن وقبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول ومبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کئے ہیں، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم وفلسفہ میں نہیں، بلکہ ان کے عمل میں ہے، اس لیے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر وقیمت اس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں ان کی عالمانہ تحقیق وتلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ اللہ کے احکام ہیں، وہ اللہ کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ، اور عقل میں سے

جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے' ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت وموافقت زیادہ ہوگی' اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا' اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے' پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے' اس کا وجدان بھی یہی ہو' اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے' اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے' اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے' الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی' اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا' اور جس قدر اس توفیق میں کمی ہوگی کہ اللہ کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو' یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے' یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو' اسی قدر اس کے روحانی وایمانی کمال میں نقص پیدا ہے' کتنا ہی نیک کام ہم اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیں' لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا' اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سمجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے اللہ کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے' جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے' اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصول مسرت یا افادہ عام کی غرض سے انجام دے' مگر اللہ کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے' تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی:

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے' اس لیے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی' نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے' اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں' اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی' مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے' اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے' ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں' اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت چن دیں' لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہہ میں ذاتی نفع یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے' تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے' لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان ونمک ہی رکھ دیں' تو اس کی وقعت اور قدر وقیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی' تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت:

اسی لیے آنحضرتؐ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے' بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا' جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے' ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی' ایک

شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے، یا سخت تکلیف پہنچائیں گے اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا، اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا ابدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا۔ جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوہ پڑا دیکھا، اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھالیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا، اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھالیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا، اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورہ آل عمران میں ہے۔

﴿وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ نُؤْتِہٖ مِنْھَا﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے، جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ۔۳۶)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جن کی تفسیر میں آنحضرت نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں

﴿انما الاعمال بالنیات﴾ (صحیح بخاری باب اول)

انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے

﴿ ولكل امرى مانوى فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امرأة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه﴾ (صحيح بخاری جلد اوّل باب ما جاء ان العمل بالنية)

ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے، تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے، اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے، تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے، اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کے حدود سے باہر، اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفہ اخلاق کی تائید:

آنحضرت کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفہ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان، ایس میکنزی اپنی تصنیف ''مینول آف ایتھکس'' کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے۔

''جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔''

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہیں۔

''اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ ''بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شئے نہیں ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے'' [1]

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط:

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے، اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاں گزیں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اللہ اور قیامت پر ایمان لانا ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے، کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (بقرہ۔۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمان صحیح جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے، آب حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ﴾ (نور۔۵)

اور جو اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو۔

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (نور۔۵)

یا (اللہ اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے، اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقف اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غرض و غایت:

اسی لیے آنحضرت کی شریعت کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آ سکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت کا

راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے' بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاص کی غرض و غایت کیا ہونی چاہئے' حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ' پست اور بلند متعدد غرضیں اور رعایتیں ہوسکتی ہیں' ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں' اور اس کو اس کے گھر تک با آرام پہنچا دیتے ہیں' ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کے بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا' یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے' یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے' یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے' بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے' وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں' بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں' غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض' مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہوسکتے ہیں' لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں' اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی ونفسانی غرض و غایت سے پاک ہے' اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے' کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے' اس کے بعد عزت وشہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے' مگر پہلے سے بلند ہے' پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے' مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے' یہ بالکل فطری بات ہے' کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے' مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے' اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں' لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں' لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے' اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے' اس لیے یہ نکتہ یادرکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے' مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دی گئی ہے' یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں۔

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز:

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے' اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے' غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے' قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے' یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں

ہے، ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت، یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے، اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے۔

﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴾ (الشمس)

ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے، اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام نفس لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامہ میں ہے۔

﴿ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴾ (قیامہ۔۱)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا۔

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴾ (قیامہ۔۱)

بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔

نواس بن سمعان انصاریؓ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا، اور انھوں نے دریافت کیا، فرمایا "نیکی حسن اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے، اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں" اسی طرح وابصہ بن معبدؓ نام ایک صاحب خدمت نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چاروں طرف جان نثاروں کا ہجوم تھا، اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا "وابصہؓ قریب آ جاؤ" جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہؓ میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے" عرض کی "حضور ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا "وابصہؓ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو" عرض کی "سچ ہے یا رسول اللہ" فرمایا

﴿ یا وابصة استفت قلبك و استفت نفسك البر ما اطمان الیه القلب و اطمانت الیه النفس و الاثم ما حاك فی القلب و تردد فی النفس و ان افتاك الناس ﴾ [1]

---

[1] مسند ابن حنبل، ج ۴ ص ۲۲۸۔

اے وابصہؓ! اپنے دل سے پوچھا کر، اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر، نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو، اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ پن میں ڈالے اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

یہی وہ حاسہ اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش میں آ کر جب توبہ واستغفار کرتا ہے، اور پشیمان و نادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

﴿ان العبد اذا اخطا خطيئة نكتت فى قلبه نكتة سوداء فاذاهو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه وان عادزيد فيها حتىٰ يعلو قلبه﴾

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور اللہ سے مغفرت مانگی، اور توبہ کی، تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے، اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾[1] (تطفیف۔ ۱)

کبھی نہیں، بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔

آنحضرتؐ نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہیں، اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں، لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، اور ادھر ادھر مڑو نہیں جب کوئی راہ گیر اللہ کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی والا پکار کر کہتا ہے ''خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے'' پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں، اور یہ پردے اس کے حدود ہیں، اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے

﴿هو واعظ الله فى قلب كل مومن﴾[2]

وہ اللہ کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط:

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی، اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے

---

[1] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

[2] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد وبیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً۔

حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں، اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہئے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ ہے اللہ اور اس کی رضامندی کا حصول۔

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے، اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض و غایت نہیں، بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾ (حجرات۔۱)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا، اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہؐ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی۔

﴿ اذا سرتكُ حسنتك و ساء تك سيئتك فانت مؤمن ﴾ [1]

جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے، اور تمہاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو۔

﴿ من سرّته حسنة و ساء ته سيئة فهو مؤمن ﴾ [2]

جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنادے وہ مومن ہے۔

﴿ من عمل سيئة فكرهها حين يعمل و عمل حسنة فسّرفهو مؤمن ﴾ [3]

جس نے جب کوئی برائی کی، تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی، اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش

---

۱ مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵، صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴ حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر و ابن حبان و ابوداؤد عن عمرؓ بن الخطاب۔

۲ طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ، کنز العمال ج ۱، ص ۳۷

۳ مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۳ حیدرآباد

باقی رکھی ہے، اور پیغمبر اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الٰہی:

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے، اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہیں آکر فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈھتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، اور معلم حکمتؐ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال، اور انہی دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (بقرہ۔۲۵)

بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں، اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا۔

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنی دولت اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (نساء۔۱۷)

اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (رعد۔۳)

اور جنھوں نے اللہ کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جوان کو دیا ہے، اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورہ لیل میں کھولی گئی ہے۔

﴿ اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ، وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴾ (لیل)

جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو، بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں یارسول اللہ کوئی

اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے' کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے' کوئی اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو' تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے' فرمایا ''اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ اللہ کی بات بلند ہو''[1] ایک دفعہ ارشاد فرمایا ''گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب' کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے' اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو باندھتا ہے' تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے' پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ اللہ نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے' تو وہ رحم وشفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے' اور اس کا حق ادا کرتا ہے' اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے''[2]

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے' اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے' اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے' حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا' اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی' اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے' اور جو جہاد میں مارے گئے تھے' اور جو دولت والے تھے' پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا' کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا ''بارالہا! میں شب وروز نماز میں قرآن پڑھتا تھا' اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے' فرشتے کہیں گے یہ جھوٹا ہے' پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پاچکا) پھر دولتمند سے اللہ فرمائے گا' کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا' یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا' عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا' تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا' اور خیرات دیتا تھا' ارشاد ہوگا' تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے' پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے' تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پاچکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا' تو اللہ اس سے دریافت کرے گا' تو کس بات کے لیے مارا گیا' کہے گا اے اللہ تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا' اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے' اللہ کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا' پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے''[3]

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے' پھر بولے اللہ اور اس کا رسول سچا ہے' اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد' ج ۱' ص ۳۹۴۔

[2] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ۔

[3] جامع ترمذی باب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (ھود۔۲)

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے بے کم و کاست' ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں' مگر دوزخ اس دنیا میں انھوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت' خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے' اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے' بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں' بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

﴿وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ﴾ (رعد۔۳)

اور جنھوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ (لیل:۹۲)

اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا۔

﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الروم۔۴)

تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا' ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول:

آنحضرتؐ کے ذریعہ سے اصول اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے' توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے' جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی' انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہ' تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں' مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے' ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے داغدار ہے' عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے' گناہ اس کا مایہ خمیر ہے' کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا گنہگار تھے' اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے' جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں' اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا'

اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہ گار مرا' اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا' بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا' کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے' اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بلٰی یعنی اللہ کا اعتراف ہر انسان روز ازل کر چکا ہے' اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا' اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے' اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوح فطرت پر جو زریں حروف لکھے ہیں' وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اس کو ابھار کر چکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے' فرمایا

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴾ (التین)

ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے' دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴾ (انفطار۔۱)

جس اللہ نے تجھ کو بنایا' پھر تجھ کو برابر کیا' پھر تجھ کو ٹھیک کیا' پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورہ انفطار کی ہے' اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے' اس کے بعد یہ آیت ہے' جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے' اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' کے ہیں' یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا' نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی' اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے' دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے' سورہ اعلیٰ میں ہے۔

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی ۝ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴾ (اعلیٰ۔۱)

اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر' جس نے پیدا کیا' پھر برابر کیا' اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔

راہ دکھنا یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے' جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں' سورہ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ (دہر۔۱)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا' پلٹتے رہے اس کو' پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا' ہم نے اس کو راہ سجھا دی تو وہ یا شکر گذار (نیکوکار) ہوتا ہے یا ناشکرا (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی' اب عقل و تمیز آنے کے بعد اللہ کا شکر گذار یا ناشکر' نیکوکار یا بدکردار' اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے' سورہ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴾ (شمس۔۱)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا، اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا)

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گنہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اس لیے یہ کہا گیا۔

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (روم۔۴)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنانے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دین فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا [۱] اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی نے اسی مسئلہ کو ایک ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا ﴿الست بربکم﴾ کیا میں تمھارا پروردگار نہیں؟ انھوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا ﴿بلی﴾ ''ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔'' یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ''دیکھو شیطان نے تمھارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔''

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں آتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ (فاطر۔۳)

اور ایک کے گناہ کو بوجھ دوسرا نہیں اٹھایا۔

﴿ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴾ (طور۔۱)

ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ الا لایجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ ﴾ [۲]

۱ صحیح بخاری ومسلم کتاب الایمان۔

۲ سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر۔

ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے فرمایا کہ ''اللہ کا قلم بچہ سے اس وقت تک کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔''[1]

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں آپ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے وہ اللہ کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے [2] آنحضرت کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا ''یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا۔'' [3] اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے فرمایا ''اللہ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے'' [4] لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی ایک دفعہ رویا میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مر گئے صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے بچے! فرمایا ''اور مشرکوں کے بچے بھی۔''[5] ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف اللہ کا کام ہے اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ ﷺ نے مناسب نہیں سمجھا ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی ''یا رسول اللہ اس کو مبارک ہو یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔'' فرمایا ''اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کئے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ''[6] ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مر

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق وترمذی فی من لایجب علیہ الحد۔
[2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد۔
[3] ابن ماجہ کتاب الجنائز۔
[4] صحیح مسلم کتاب القدر۔
[5] یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد جلد ۲ صفحہ ۳۳۰ و ۳۲۷)
[6] ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

جانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جوان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اوران کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے "اے اللہ! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔" احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔"[1]

خوف ورجا:

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دوگروہ گذرے ہیں، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش وآرام اور بہار ورونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو، کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو، اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں، اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا، اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست وسرشار ہوتا ہے، اور اس کو نیک وبد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے، کہ دل بادہ غفلت میں سرشار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر وقت تک اللہ کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے، اس کی شریعت میں اللہ سے ناامیدی اور کفر ایک ہے۔

وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا۔

﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴾ (حجر۔۴)

(ابراہیم) ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوبؑ کی زبانی تعلیم ملی۔

﴿ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (یوسف۔۱۰)

اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو، اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو اللہ کے منکر ہیں۔

اس امت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے۔

﴿ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ (زمر۔۲)

اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پرامید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ

---

[1] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیہا صحیح بخاری ومسلم وترمذی کتاب الحج۔

تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں۔''[1] یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے' وہی اس کے لیے ہو جاتا ہوں' اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے۔

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ﴾ (زمر)

بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے' رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے' اور کھڑا ہوتا ہے' آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں' گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے' اور اللہ کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے' اللہ کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے' یہ ڈر اس کو غافل' بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا' اور یہ امید اس کو مایوس' غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتیں' اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے' اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے۔

﴿ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ﴾ (نساء۔۱۵)

اور تم کو اللہ سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے' کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے' اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے' وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے' اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے' لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا' تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا' اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا' اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو' اللہ کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا' اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے' اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے' اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے' ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں' یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے' جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں' مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا' اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی' امیر ہو کہ غریب' تندرست ہو کہ بیمار' اولاد والا ہو کہ بے اولاد' کامیاب ہو یا ناکام' دولت مند ہو یا دیوالیہ' ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے' مشکلات میں' بیماریوں میں' محتاجیوں میں' ناکامیوں میں' ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں' اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے' کہ اس کے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ:

[1] جامع ترمذی' کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

﴿اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ﴾ (آل عمران-۳)
میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

اخلاق اور رہبانیت:

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں' ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں' اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے' جو رہبانیت' تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے' اسی لیے گوشہ نشینی' عزلت گزینی' خلق سے کم آمیزی' جماعت سے علیحدگی' اہل وعیال' عزیز واقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی' اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھودیتی ہے یا کم کردیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کرلی ہے' اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے' اور وہ خود ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے' لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے' اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کرسکیں' اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ واقارب' دوست واحباب اور قوم وملک وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں' اسی لیے اسلام نے اپنے اصول اخلاق میں راہبانہ' جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے' نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہوکر گذاری ہے' یہی طرز عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا' اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے' تجرد' علیحدگی' خلوت نشینی' ترک عمل اور ترک جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہوسکتے ہیں' ان سے ہٹ کر نہیں' وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہوکر زندگی بسر کرتے ہیں' کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت' تعلیم وموعظت' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں' حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں' اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں' قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (تحریم۔۱)

تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ﴿کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ﴾ ''تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔'' [1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا۔

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (انفال۔۳)

اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپیٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا درحقیقت جدوجہد اور داروگیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے، اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

﴿ان المسلم الذی یخالط الناس و یصبر علی اذا ھم افضل من الذی لا یخالط الناس و لا یصبر علی اذا ھم﴾ [2]

وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے، اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ

۱۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المراۃ راعیۃ فی بیت زوجہا، ص ۷۸۳۔

۲۔ شعب الایمان، بیہقی و جامع ترمذی، کتاب الزہد ص ۴۱۲۔

اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا' اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

آپ نے فرمایا کہ "بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے' اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے' اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔"[1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اسلام کے اس اصول اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے' اسی اخلاقی فرض کا دوسرا شرعی نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے' قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے۔

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (آل عمران۔۱۲)

تم سب سے بہتر امت ہو' جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو' اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

﴿ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (توبہ۔۹)

وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (لقمان۔۲)

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ (العصر)

اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ (بلد:۱)

اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟"[2] عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام "شخصی آزادی

---

۱ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۲ سفر تکوین ۴۔۹۔

کی بحالی'' ہے۔لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے،آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ ''﴿کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته﴾ ''(تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی) قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تا کہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف،لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔بنی اسرائیل کے لئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی۔وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا،دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا،تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنیوالا ہے لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا،پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے،سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے،آخر میں ہے:۔

﴿ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ o فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ (اعراف:۲۱)

اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کیلئے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گناہ گاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا،البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے،زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں،فرمایا

﴿ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ (مائدہ۱۳،نور۷)

رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی،اسی لیے سورہ مائدہ میں فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ﴾ (مائدہ:۱۴)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں"۔ ایک دوسرے صحابی ابوثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ "نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے"۔ [1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟" منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ قوموں کے رسوم وآداب اور ایٹی کیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع ونقصان کرنیوالے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داوٗد اور عیسیٰ علیہما السلام کی معرفت ان پر لعنت کی"۔ اس کے بعد آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا "نہیں! جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکا دو"۔ [2]

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط:

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل وعامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی، کتاب التفسیر (مائدہ) میں ہیں، ص ۴۹۸۔۴۹۹۔

[2] جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (بقرہ:۵)
کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔
اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمائش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا۔

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (نحل:۱۶)
تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔
حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:۔

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ (طٰہٰ:۲)
تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔
ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:۔

﴿ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴾ (نساء:۹)
اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔
یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن وامان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کیلئے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت:

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار؟''

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ اور ایک نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادتند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت

ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرمادیا ہے کہ ﴿ انما الاذن لاجل الرؤیة ﴾ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے چنانچہ وحی محمدی نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور پر ممانعت کی، فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (حجرات:۲)

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بیشک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنیوالا مہربان ہے۔

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آ جائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنیوالے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایاں نہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے''۔[1]

غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال:

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے آیا اور سلسلہ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب النھی عن التجسس۔

نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان ودرگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔ [1] اسی طرح حضرت عیسیٰؑ مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت بہت کم پائی جاتی ہے۔ [2] حضرت موسیٰؑ کی شریعت نے دنیا کیلئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کردیئے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا۔

> ''تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ [3] لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو۔ بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔ تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو''۔ (متی، باب ۵)

حضرت عیسیٰؑ سے پہلے دنیا نے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا وہ حضرت موسیٰؑ کا قانون تھا جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰؑ کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کردیا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ (نحل:۱۳)

بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔

عدل واحسان:

''عدل اور احسان'' کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کیلئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد درحقیقت ''عدل'' پر ہے۔ ''عدل'' کے معنی ''برابر'' کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ''عدل'' ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کردینا اور درگزر کرنا یہ ''احسان'' ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان ومال وآبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے توراۃ کے قانون عدل کا خاتمہ کر

---

[1] یہود کی سنگدلی کے سبب سے۔

[2] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کیلئے۔

[3] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

دیا، کبھی دنیا کے لئے قابل عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانون عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہوسکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کردینے کا پورا پورا حق نہیں ہے کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کرکے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کررہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لئے معاف کردینا، درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لئے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور ''برائی، برائی کے بقدر'' کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ان کو رضامند کرلیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق:

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، اور گوان دونوں کا منشاء ایک ہی ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتاً نہیں ہوسکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدی میں دو حیثیتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دیدی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کرکے قانون کو بھی اخلاق بنادیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرکے ہر ایک کی حد مقرر کردی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچادیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومت اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسی طرح شریعت محمدی اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل وانصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ ومحسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام:

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاق محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے۔

> ''اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا ...... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت'' (احبار ۲۴۔ ۱۷، خروج ۲۱۔ ۱۲، گنتی ۳۵۔ ۳۱، استثناء ۱۹۔ ۱۱۔ ۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے۔

> ''تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے'' (متی ۵۔ ۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں۔ اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ﴾ (بقرہ:۲۲)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (بقرہ:۲۲)

تو اگر اسکے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لئے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد انکے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خون بہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے۔

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (مائدہ:۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲: یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانون و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے، فرمایا

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ (بقرہ:۳۸)

اور اگر تم سود سے باز آ گئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ط وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(بقرہ:۳۸)

اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہے۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا۔

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (نحل)

اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنیوالوں کیلئے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ o وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (شوریٰ:۴)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ازخود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (واصلح) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دیدیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تا کہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تا کہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کیلئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (نور:۱)

اورتم کواللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہگاروں پرترس نہ آئے ،اگرتم کوخداپراورقیامت پرایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جوسزا خدا کے ہاں ہےاور جوقیامت میں ہوگی ،وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی ،اس لیےاس گناہ کی سزادنیا میں ہی دے دینادرحقیقت اپنے گنہگار بھائی پراحسان کرنا ہے۔اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچےاورامیروغریب کےفرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کوسزا نہ دی جائے اوراس کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا''اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تواس کوچھوڑ دیتے تھےاوراگرکوئی معمولی آدمی اسی کام کوکرتا تواس کوسزادیتے۔خدا کی قسم اگرمحمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا'' [۱]

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ'' آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کوتوڑا ہے [۲] تواس کو(قانوناً)سزاملی ہو''۔یہ عمل تھا۔تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ''میں نے آپ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھالیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اوردرگزرکرنے کا مشورہ دیا'' [۳] یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یادیت (زرتاوان یاخون بہا) لےکرمعاف کردینے کوفرمایا۔معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سےفرمایا''آپس میں گناہوں کومعاف کردیا کرولیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا توسزاضروری ہوجائیگی'' [۴] یعنی جب مرافعہ اوراستغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہوجائیگا تو پھرسزا ہونا واجب ہے تا کہ حکومت کا رعب دلوں پرقائم رہے۔چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سورہے تھے۔ایک شخص نے چپکے سے چادراتارلی،وہ پکڑا گیااورعدالت نبوی میں پیش کیا گیا،آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔جن صاحب کی چادرتھی انہوں نے عرض کی کہ''یارسول اللہ! کیاتمیں درہم کی ایک چادر کے لئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا،میں یہ چادراس کے ہاتھ ادھارفروخت کردیتا ہوں''۔فرمایا کہ''میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کرلیا'' [۵]

یہ تواس عفو کا حال ہے جس کوایک حدتک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہےاوراس لحاظ سے قانون محمدی ، موجودسلطنتوں کےقوانین سے زیادہ نرم ہے،زیادہ منصفانہ اورعقل کےزیادہ مطابق ہے،لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

---

۱ صحیح بخاری جلددوم کتاب الحدود،ص۱۰۰۲۔

۲ ایضاً کتاب الحدود۔

۳ ابوداؤدونسائی کتاب الدیات۔

۴ ابوداؤدکتاب الحدود۔

۵ ایضاً کتاب الحدود۔

عفوودرگزر کی تعلیم:

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے، وہ عفو، درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت وجلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں''۔

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (انعام:۱۳)

اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (اعراف:۲۴)

معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر، اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آ جائے) تو خدا کی پناہ پکڑ، وہ ہے سنتا جانتا۔

سکون کی حالت میں عفوودرگزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔

صحابہؓ کی تعریف میں فرمایا۔

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (شوریٰ:۴)

اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔

نیکوکاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے

﴿ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران:۱۴)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا۔

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (شوریٰ:۴)

اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی نے اپنے الفاظ میں ''عزم'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (احقاف:۴)

اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہئے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (لقمان:۲)

اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (آل عمران:۱۹)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ (جاثیہ:۲)

(اے پیغمبر) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک ہیں۔ اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:۔

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (نساء:۲۱)

اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہئے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (نور:۳)

اور چاہے کہ معاف کریں اور درگذر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا اس میں عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی:

عفوودرگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی ''بڑا خوش قسمت'' رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا

﴿ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ○ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ (حم السجدہ:۵)

نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسا ناتے دار دوست، اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ''بڑی خوش قسمتی'' سے تعبیر کیا ہے، اس سے اسکی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ○ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ ○ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾ (مومنون:۶)

مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ○ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ ﴾ (رعد:۳)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لئے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لئے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا:

﴿ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد:۳)
تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دل آزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں۔

﴿ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ﴾ (قصص:۶)

وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں تو اس سے درگذر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو'' [۱] ایک دفعہ ایک صحابی نے آ کر عرض کی کہ ''اے خدا کے پیغمبر میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو'' یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔ [۲] حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو''۔ [۳]

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی۔

---

۱ صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔

۲ صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔

۳ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، ص ۳۳۴ (غریب)۔

﴿ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (مائدہ:۳)

اوران میں سے چند کے سوااوروں کوکسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کراوران کے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اوران کے قصوروں سے درگذر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنیوالوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظام حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں' ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے' بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظام حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرّہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا' لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے' اور گردو پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی' ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے' اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے' لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے' بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں' موقع واردات کا سراغ دیتے ہیں' مال مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں' وغیرہ وغیرہ، بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے' وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے' اور وحشیانہ نظام حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی' تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری:

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے' اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے' اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے' مثلاً اصول شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے' اس لحاظ سے عقائد میں' اعمال میں' عبادات میں' معاملات میں' اخلاق میں' جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں' ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی' اور جو چیزیں جائز اور مصالح عامہ کے موافق تھیں' ان کی ترغیب دی' لیکن امر و نہی کے طریقے' اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے' اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے' اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے' جس سے برائیوں کا تمام تر سدباب ہوتا ہے' اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو' اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو' اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو' اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے' اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے' اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل' ہمہ گیری اور انضباط ہے' یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے' اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں' اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا امّ الاصول ہے' لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی' اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا' صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے

شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی' اور ان کا کلی استیصال کیا' شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا' اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی' اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے' لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں' تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی' تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی' اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا' کسی کی مدح میں غلو واغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے' تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ وطاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے' اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے' اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا' تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے' جس نے اممِ قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی' اس لیے آنحضرت ﷺ نے برسرِ منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

﴿لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله﴾

(بخاری کتاب الانبیاء)

میری شان میں مبالغہ نہ کرو' جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں' تو کہو کہ اللہ کا بندہ اور رسول۔

یہ ایک کلی حکم تھا' اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی' اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی' یہی حال عبادات کا بھی ہے' اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا' اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے' اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا' اور کوئی بات سوال وجواب کے لیے باقی نہیں رکھی' یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲۔ ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

۳۔ نرمی وگرمی' عاجزی وبلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ:

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے' بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنا لی گئی ہے' اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے' حضرت موسیٰؑ کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے' یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے' ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید' دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت' تیسرا اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت' اور چوتھا سبت کے دن آرام

کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے' باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں' جو حسب ذیل ہیں [1] (دیکھو خروج باب ۲۰)

۱۔ تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲۔ تو خون مت کر۔

۳۔ تو زنا مت کر۔

۴۔ تو چوری مت کر۔

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی' اور اس کے بیل' اور اس کے گدھے' اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے' اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں' یعنی مسافر' بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم' اور جھوٹی گواہی کی ممانعت' پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے۔

۱۔ تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

۲۔ تم چوری نہ کرو' نہ جھوٹا معاملہ کرو' ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳۔ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴۔ تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر' نہ اس سے کچھ چھین لے' تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵۔ تو بہرے کو مت کوس' تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶۔ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر' غریب و امیر کو نہ دیکھ' بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷۔ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر' اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے' اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔

۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے' اٹھ کھڑا ہو' اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمھاری زمین پر تمھارے ساتھ سکونت کرے' تم اس کو مت ستاؤ' بلکہ مسافر کو جو تمھارے ساتھ رہتا ہے' ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے' بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں' پیمائش کرنے میں' تولنے میں' ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام:

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے' بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے' حضرت عیسٰیؑ کی

[1] توراۃ کے اخلاقی احکام۔

بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی' یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے' اخلاق میں بھی جھلکتی ہے' حضرت عیسیٰؑ کی اخلاقی تجدید واصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور' حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں' اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے' ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا' اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

دل کی غریبی' غمگینی' حلم و بردباری' راست بازی' رحم دلی' پاک دلی' صلح جوئی' صبر' عفو ودرگذر' پاکدامنی' قسم کھانے کی ممانعت' ظالم کا مقابلہ نہ کرنا' قرض معاف کرنا' دشمنوں کو پیار کرنا' ریا کی ممانعت' توکل' عیب نہ لگانا' جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کریں' ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں' بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں' اور حضرت عیسیٰؑ کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا:

محمد رسول اللہﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں' اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا' بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا' اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں' ان سب کو استقصاء کر کے منع کیا گیا' اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا' اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی' گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا' یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی' آنحضرتﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصاء کیا' اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا' ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں' جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست:

سچ بولنا' جھوٹ کی برائی' علم بے عمل کی مذمت' عام عفو ودرگذر' توکل' صبر' شکر' حق پر استقامت' اللہ کی راہ میں جان دینا' سخاوت اور خیرات کا حکم' بخل کی برائی' اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت' میانہ روی کی تاکید' عزیزوں' قرابتداروں' یتیموں' مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی' مسافروں' سائلوں اور غریبوں کی امداد' غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان' فخر وغرور کی برائی' امانت داری' وعدہ کا ایفاء کرنا' عہد کا پورا کرنا' معاہدوں کا لحاظ رکھنا' صدقہ و خیرات' نیکی اور بھلائی کی بات کرنا' آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا' کسی کو برا بھلا نہ کہنا' کسی کو نہ چڑھانا' نہ برے ناموں سے یاد کرنا' والدین کی خدمت اور اطاعت' ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا' حق گوئی' انصاف پسندی' سچی گواہی دینا' گواہی کو نہ چھپانا' جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر' نرمی سے بات کرنا' زمین پر اکڑ کر نہ

چلنا' صلح جوئی' اتحاد و اتفاق' ایمانی برادری' انسانی برادری' اکل حلال' روزی خود حاصل کرنا' تجارت کرنا' گداگری کی ممانعت' لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا' اولاد کشی خودکشی' اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت' یتیم کی کفالت' اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت' ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا' ملک میں فساد برپا نہ کرنا' بے شرمی کی بات سے روکنا' زنا کی حرمت' آنکھیں نیچی رکھنا' کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا' ستر اور حجاب' خیانت کی برائی' آنکھ' کان اور دل کی باز پرس' نیکی کے کام کرنا' لغو سے اعراض' امانت اور عہد کی رعایت' ایثار' تحمل' دوسروں کو معاف کرنا' دشمنوں سے درگذر' بدی کے بدلہ نیکی کرنا' غصہ کی برائی' مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ' مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا' فیصلہ میں عدل و انصاف' دشمنوں تک سے عدل و انصاف' صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی' اُلاہنے کی مذمت' فسق و فجور سے نفرت' چوری' ڈاکہ' رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت' دل کا تقوی اور پاکیزگی' پاکبازی جتانے کی برائی' رفتار میں وقار و متانت' مجالس میں حسنِ اخلاق' ضعیفوں' کمزوروں' اور عورتوں کے ساتھ نیکی' شوہر کی اطاعت' بیوی کا حق ادا کرنا' ناحق قسم کھانے کی برائی' چغل خوری' طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت' جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت' شرمگاہوں کی ستر پوشی' سائل کو نہ جھڑکنا' یتیم کو نہ دبانا' اللہ کی نعمت کو ظاہر کرنا' غیبت نہ کرنا' بدگمانی نہ کرنا' سب پر رحم کرنا' ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی' قرض دینا' قرض معاف کرنا' سود اور رشوت کی ممانعت' ثبات قدم' استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی' لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی' شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت' بھوکوں کو کھانا کھلانا' ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز' بے غرض نیکی کرنا' مال و دولت سے محبت نہ ہونا' ظلم سے منع کرنا' لوگوں سے بے رخی نہ کرنا' گناہ سے بچنا' ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش' معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست:

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے' ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان قوال میں ہے جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں' ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے' آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں' اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں' ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعی اسلامؐ کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو' ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری' جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں

صلہ رحمی' ماں باپ کے ساتھ سلوک' بچوں سے محبت' چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت' اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا' ہمسایوں کے ساتھ سلوک' غلاموں کے ساتھ سلوک' غلاموں کا قصور معاف کرنا' اہل و عیال کی پرورش' یتیموں کی پرورش' بیوہ کی خبر گیری' حاجت مندوں کی امداد' اندھوں کی دست گیری' عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی' قرضداروں پر

احسان، فریادیوں کی فریادرسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت وبہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر وامام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو ودرگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق ونرمی، قناعت اور استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغل خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع وخاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح وستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر وغرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل وانصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری وغمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت وصفائی، دوست احباب کی ملاقات، سلام وتحیت، مصافحہ ومعانقہ، دیگر آداب ملاقات، آداب مجلس، آداب طعام، آداب لباس، آداب نشست وبرخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء:

انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اس کی توضیح کے لیے امر ونہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ وخیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی

تفصیل کر دی‘ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے‘ شریعت محمدی نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی‘ وہ اجناس مقرر کر دیئے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے‘ ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا‘ ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی‘ اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہ اللہ میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا۔

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (بقرہ ۲۷)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں‘ کہہ دے کہ جو تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو تو یہ تمھارے کمال خلق کی دلیل ہے‘ انصارؓ جنھوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرینؓ کی مصیبتیں دور کیں‘ ان کی تعریف میں اللہ نے فرمایا۔

﴿ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (حشر)

وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں‘ اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا۔

﴿ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ (دھر)

خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین‘ یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز اللہ کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی‘ خراب اور نکمی ہو‘ قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے‘ نفس کی اور دنائت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے‘ فرمایا۔

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ (آل عمران ۱۰)

تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے‘ جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو‘ جو تم کو محبوب ہے‘ اور جو بھی تم خرچ کرو‘ اللہ کو اس کا علم ہے

پھر فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ (بقرہ ۳۷)

اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو‘ اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمھارے لیے زمین سے نکالتے ہیں‘ اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دو‘ اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو‘ کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو‘ مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو‘ اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو‘ کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ”وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔“ یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی‘ اس کا یہ سبب

نہیں کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے، کہ وہ ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمھاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل و عیال، دست نگر، عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر۔

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ ۲۶)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے، جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے، اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا، مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے"۔ [1]

دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔" [2] غور کیجیے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ اپنا احسان اس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمائش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا۔

﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾ (مدثر ۱)

اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (بقرہ ۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ ۳۶)

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ، ص ۴۶ مصر۔

[2] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب صنائع المعروف۔

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے، اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

ریاء اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو، اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو۔

﴿ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـکُمۡ‌ؕ وَيُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ سَيِّاٰتِکُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴾ (بقرہ ۳۷)

اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے، اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے، اور اللہ تمھاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

﴿ اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴾ (بقرہ ۳۸)

جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے۔

﴿ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴾ (توبہ۔۷)

اور وہ اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔

صدقہ و خیرات پکے دل سے اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِيۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبۡوَةٍ ﴾ (بقرہ ۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود اللہ ہو۔

﴿ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ‌ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴾ (بقرہ ۳۷)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر، اور جو خیرات کرو گے، وہ تم کو پوری ملے گی، تمھارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ و خیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ:

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے

محفوظ نہیں رکھا جا سکتا' اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے' مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا' لیکن اس کی تجارت کرتا ہے' ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے' لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے' جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے' لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

﴿قال رسول اللہ ﷺ لعن اللہ الخمر و شاربھا و ساقیھا و بائعھا و مبتاعھا و عاصرھا و معتصرھا و حاملھا والمحمولة الیه﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ ﷺ نے فرمایا' اللہ شراب پر' اس کے پینے والے پر' اس کے پلانے والے پر' اس کے بیچنے والے پر' اس کے خریدنے والے پر' اس کے نچوڑنے والے پر' اس سے اپنے لیے نچڑوانے والے، پر اس کے لے جانے والے پر' اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے' لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے' سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (تعریف) بتائے' عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی' اس کے مختلف نام تھے' اور ان کا اثر بھی مختلف تھا' قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے' اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرمادی۔

﴿قال رسول اللہ ﷺ ان من العنب خمراً و ان من التّمر خمراً و ان من العسل خمراً و ان من البر خمراً و ان من الشعیر خمراً﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ ﷺ نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے' کھجور سے بھی' شہد سے بھی' گیہوں سے بھی' اور جو سے بھی۔

﴿قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الخمر من العصیر و الزبیب والتمر والحنطة والشعیر والذرة و انی انھاکم عن کل مسکر﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ شراب انگور' منقی' کھجور' گیہوں' جو' جوار اور ہر چیز کے نچوڑ سے بنتی ہے' اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی' اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی' لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا' اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں' اور تحدید ان کو شامل نہ ہو' اس لیے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی۔

﴿کل مسکرٍ خمر' و کل مسکر حرام﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ، وصحیح مسلم، واحمد، وترمذی، ونسائی)

ہر نشہ آور چیز شراب ہے' اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

﴿کل شراب اسکر فھو حرام﴾ (ابوداؤد، واحمد، وبخاری، ومسلم)

ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا' حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے

مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لیے فرمایا۔

﴿ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں، اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرجات کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی۔

﴿ نھیٰ رسول اللّٰہ عن کل مسکرٍ و مفترٍ ﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آنحضرت ﷺ نے ہر منشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا۔

﴿ یقول یشربن ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا ﴾ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

﴿ نھی عن الدباء و الحنتم و المذفّت و النقیر ﴾

آپ ﷺ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان، اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لیے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنالیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہ دی۔ [1]

ایک بار دیلم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں، اور سخت کام کرتے ہیں، اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا، کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انھوں نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انھوں نے کہا، لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں، تو ان سے جہاد کرو"۔ [2]

---

[1] ابوداؤد، جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ، اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

[2] ابوداؤد، جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی' انجیل نے بھی ''ناروا نفع'' سے لوگوں کو روکا ہے' تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے' لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت' ربا کے اقسام' کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے' اس کی پوری تفصیل کی' اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا' اس ظلم میں جو لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں' ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

﴿لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا و موکلہ و شاھدہ و کاتبہ﴾ (ابوداؤد کتاب البیوع)

آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے' سود کھلانے والے' اس پر گواہی دینے والے' اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء:

﴿لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی﴾

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل' استقصاء اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے' کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے' اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں' اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے' اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتہً قلع وقمع نہیں ہو سکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری:

مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی' کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور ہر دو قسم میں کر دیا تھا' یعنی تواضع' خاکساری' فروتنی' عاجزی' خواری' بردباری' مسکینی' غریبی' غمگینی وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا' اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی' حالانکہ دنیا کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے' جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے' اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے' جس طرح عفو و درگذر بلند ہمتی کا کام ہے' اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے' محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی' مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیے' کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر:

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بے جا اعتراضات کے جو تیر برسائے' اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے' وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری' عاجزی' خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں' جن سے لوگوں میں عزم' بلند ہمتی' استقلال' ثبات قدم' عزت نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے' وہ کہتا ہے۔

''مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے'' [1]

اسلامی اخلاق کا اعتدال:

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیحؑ کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی، اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گذری تھی، کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد:

اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کار آمد نہیں ہو سکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے، جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح:

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ، اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے، اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ اللہ سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اللہ سے مانگنے والا کر دے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار، اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے، اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوت غضب اور قوت شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے

[1] نٹشے از ایم اے مگے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم۔

مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں' اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے' غضب کی قوت اگر افراط وتفریط سے پاک ہو' اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے' اور وہ حالات وکیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے' مثلاً خودداری' دلیری' آزادی' حق گوئی' بلند ہمتی' بردباری' استقلال' ثبات قدم' وقار' صبر وسکون' مطالبہ حق' جدوجہد' سعی ومحنت' جہاد پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی' تو تہور بن جاتی ہے' اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور' نخوت' خود پرستی' تکبر' ترفع' دوسروں کی تحقیر' ظلم' قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں' اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے' تو ذلت پسندی' کم حوصلگی' بے طاقتی' خوف اور دنائت کے قالب میں ظہور کرتی ہے' اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے' تو اس کو عفت کہتے ہیں' یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے' یعنی پاکدامنی' پرہیزگاری' جودوسخا' شرم وحیا' صبر وشکر' قناعت' بے طمعی' خوش طبعی' ترقی کی خواہش' نسل واولاد کی آرزو' خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ' پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے' تو اس سے حرص وطمع' بے شرمی' فضول خرچی' بخل' ریا' اوباشی' تملق' حسد' رشک وغیرہ اوصاف ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق:

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے' اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط وتفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے' مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں' اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے' اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے ''دشمن کو پیار کرو'' اور نہ یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس وغمگین بن کر زندگی گذار دو' بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو' اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انھیں ہدایت ملے' اور اللہ کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ' لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو' امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے' غصہ کے مٹانے والے کی نہیں' اس نے ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہا ہے' ﴿وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ﴾ نہیں کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں :

دنیا میں علم وہنر' خوشی ومسرت' ولولہ وانبساط' رونق وترقی' جدوجہد جو کچھ ہے' وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں' اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں' یا ان میں افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو نیکی' سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے' نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو' نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں' نہ عدل کا وجود ہو' نہ امن وامان کا نشان ملے' نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے' نہ انسان کی بلند ہمتی' استقلال' ثبات قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایاں ہوں' قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے' اور اللہ کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے' بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے' نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں' اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں' مثلاً بے آبروئی' بے غیرتی' ذلت پسندی' دنائت' بے طاقتی' تملق' کم حوصلگی' بے عملی' مستی' فاقہ زدگی بھی برے ہیں' اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے' اس نے جہاں ان کو ﴿رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ﴾ (آپس میں رحمدل) اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی وہیں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ﴾ (کافروں پر بھاری) اور ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی' اور ان کو بتایا کہ عزت صرف اللہ اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے ﴿وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا' جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر:

لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے

''لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے۔۔۔۔۔اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا' تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا' ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو' اور حریت کے جذبات موجود ہوں' اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں' خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل' فوجی طرز زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو' تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے' لیکن اسے بالکل مٹادینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمع نظر ہے' کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا' اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں' لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے' اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا' اور اس کے دو مظاہر ہیں' ایک مردانگی اور دوسرے خودداری' انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی' آزاد خیالی' خوش معاملگی' بلند حوصلگی' غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے' وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی' بلکہ ان کے بجائے دنائت' پست ہمتی' کم ظرفی' بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں'' (فصل گیارہ)

اسلام اور بلند اخلاق:

لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلامؐ کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے' فرمایا۔

﴿ان اللہ یحب معالی الامور و یبغض سفافها﴾

بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے۔

''معالی امور'' سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام' اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں' اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا۔ کہ ایک مسلمان کو اللہ کا دوست بننے کے لیے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے' اور دناءت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے' حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

﴿المؤمن القوی خیر واحب الی اللہ من المؤمن الضعیف و فی کل خیر احرص علی ماینفعك واستعن باللہ ولا تعجز و ان اصابك شی فلا تقل لو انی فعلت کان کذاو کذا ولکن قل قدر اللہ و ما شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان﴾ (صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ)

کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے' ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور اللہ سے مدد چاہ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا' اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ''اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا'' بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے' اور جو چاہا اس نے کیا' کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر' توکل' صبر اور شکر:

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے' جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر' توکل' صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے' اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے' اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی' پر امیدی' استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو' مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے' پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ اللہ پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے' اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے' اور یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا' اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ اللہ کا منشا یہی تھا (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے۔

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (آل عمران۔۱۷)

جب تو پکا ارادہ کر لے پھر اللہ پر بھروسہ کر' بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے' اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں' اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے' اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (حدید۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے' یہ اس لیے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو' اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو' اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر' توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دناءت کے لیے نہیں' بلکہ مسلمانوں میں ہمت' جرأت' بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے' اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا' اور کامیاب رہے' ان کو مشکلات میں اللہ کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی۔

﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ (بقرہ۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر و ثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا۔

﴿ وَكَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ (آل عمران۱۵)

اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی' تو اللہ کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے' اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے' اور ان کا کہنا نہ تھا' لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما' اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے۔

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران۲۰)

اے وہ جو ایمان لائے' ثابت قدم رہو' اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی' عالی حوصلگی' بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثبات قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے' یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع' فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے' اس طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو:

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو' اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں' لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے' یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں [1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے' تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو' دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو' دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو' مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے' جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاق محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی' جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے' اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے' یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو' برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو' جو تم کو بددعائیں دیں ان کو دعا دو' جو تمھارا قصور کریں ان کو معاف کرو' اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو' فرمایا۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۲)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو' انصاف کے ساتھ گواہ بن کر' اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے' انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیز گاری سے بہت نزدیک ہے' اور اللہ سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

﴿ وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ (حم سجدہ۔۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں' برائی کو بھلائی سے دفع کرو' تو دفعتہ وہ جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی ہے' رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا' اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں' اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں' اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

۱۔ اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں' ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔ اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے' وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمھارے دشمن ہیں' کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمھارے اس نیک طرز عمل سے تمھارا دشمن تمھارا دوست بن جائے گا۔

۳۔ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا' اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے' اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاق محمدی کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے' اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ

---

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے' حضرت ابن عباسؓ جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں' اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں۔ [۱]

''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگذر کرنے کا حکم دیا ہے' وہ ایسا کریں گے' تو اللہ ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا' اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی' وہ سن کر چپ رہے' اس نے دوبارہ وہی حرکت کی' وہ پھر بھی چپ رہے' اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی' تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے' یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یارسول اللہ کیا آپ ﷺ مجھ سے خفا ہوئے' فرمایا ''اے ابوبکر جب تک تم چپ تھے' اللہ کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا' جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔ [۲]

آپ ﷺ نے فرمایا ''صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو' بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو' [۳] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں' بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آکر عرض کی' یارسول اللہ مجھے وہ بات بتایئے جس کے کرنے سے جنت مل جائے' آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں' منجملہ ان کے فرمایا ''ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔'' [۴]

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں ہوسکتا' لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے۔

﴿ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًاۢ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴾ (جاثیہ۲)

(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے' معاف کردیا کریں' تاکہ اللہ ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ''ریاکار فریسیوں'' اور ''سانپوں اور سانپوں کے بچوں'' [۵] والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے' جس نے فاتح بن کر' مفتوح ہوکر نہیں' حاکم ہوکر محکوم بن کر نہیں' بہ یک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کردیا' جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا' [۶] جس نے اس کو معاف کیا جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا' [۷] جس نے خیبر

۱ صحیح بخاری جلد۲' ص۷۱۲ و ابن جریر جلد۲۴' ص۶۸۔ مصر۔

۲ سنن ابی داؤد' کتاب الادب۔ باب فی الانتصار۔

۳ صحیح بخاری' کتاب الادب ج۲' ص۸۸۶۔

۴ مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج۲' ص۲۱۷ حیدرآباد دکن۔

۵ انجیل متی ۲۳' ۲۵' ۳۳۔

۶ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

۷ صحیح بخاری کتاب الہجرۃ۔

میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا'[1] جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا'[2] جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اوران کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا' [3] جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا' [4] جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا' جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا'[5] جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا' اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا' [6] جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر [7] کی جنھوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی' جس سے اس کے پاؤں خون آلودہو گئے تھے' جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی' [8] جس نے دشمنوں کے حق میں بد دعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں' بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں [9] انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیز گاری) کی شان بتائی گئی۔

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (توبہ ا)

لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انھوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا' اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو' اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

کفار و مشرکین سے عدم موالات:

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے' حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے' یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول' راز داری اور رفاقت سے روک دے' جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں' خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں' اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں' چنانچہ اس قسم کی آیتیں۔

---

[1] صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی۔
[2] صحیح بخاری فتح طائف۔
[3] صحیح بخاری' باب فتح مکہ۔
[4] کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ و ہبار بن اسود۔
[5] جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح ص ۵۴۰۔
[6] صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۸۔
[7] ابن سعد غزوۂ طائف۔
[8] فتح الباری ج ۷' ص ۲۸۶ مع باب احد۔
[9] صحیح بخاری مبعث النبی او مشکوۃ و اخلاق النبی بحوالہ مسلم۔

﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ﴾ (آل عمران۔۳)

ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں' تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں' مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (توبہ۔۳)

اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں' اپنا دوست نہ بناؤ' اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا' تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے۔

اسی موقع کی ہیں' ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی' فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں' اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے' اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ''شہزادۂ امنؑ'' کے اس اعلان کے ہیں۔

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا' صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں' کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ' اور بیٹے کو اس کی ماں' اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں' آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے' جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے' وہ میرے لائق نہیں'' (متی کی انجیل باب ۱۰۔۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی' رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی' جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی' وہ یہودیوں کے لیے بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے' جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی' اور بظاہر مال و دولت' ساز و سامان' اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا' تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی' کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں' تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے' اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا' فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَي

الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (مائدہ۸)

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ' وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں' اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے' وہ انہی میں سے ہے' اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا' اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں' کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے' تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے' تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں' اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں' خراب گئے ان کے عمل' پھر رہ گئے نقصان میں' اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ کا کچھ ہرج نہیں' اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اللہ راضی ہوگا' اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے' جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (مائدہ۹)

اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمھارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ' اور اللہ سے ڈرو' اگر یقین رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار' محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ' اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَّدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (آل عمران۱۲)

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ' وہ تمھاری خرابی میں کمی نہیں کرتے' جتنی تم کو تکلیف پہنچے' ان کو خوشی ہے' دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے' اور جو ان کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے' ہم نے تم کو باتیں جتا دیں' اگر تم کو عقل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے' اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے' جس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے' سب سے زیادہ تصریح سورہ ممتحنہ میں ہے' فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ

اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾(ممتحنہ ۱)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی منکر ہیں، وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو، اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں، تو تمھارے دشمن ہوں، اور تمھاری تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں، اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ تم کو تمہاری قرابت اور تمھاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیئے

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (ممتحنہ ۲)

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا، جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے، اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالتے ہیں، اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں، اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالیں اور تمھارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں، جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا، تو وہی بے انصاف ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ط وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ﴾ (ممتحنہ ۲)

امید ہے کہ اللہ تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے، اور اللہ قدرت والا ہے۔[1]

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے، تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطب ؓ بن ابی بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی، آپ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی یا رسول اللہ جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں، اور جس قدر مہاجر ہیں، وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

احسان کروں تا کہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دین حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا، آپ نے فرمایا تم بدر والے لوگ ہو اللہ نے تمھارے گناہ معاف کئے ہیں، اس پر یہ آیت اتری یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے۔

''اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں، بیزار نہیں، میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں، میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔'' (۱۳۹۔۱۹۔۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے۔

''اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو، اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو جو تمھارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو، اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کرے گا، بلکہ وہ تمھارے لیے پھندے اور دام اور تمھاری بغلوں کے لیے کوڑے اور تمھاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمھارے اللہ نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے (یشوع باب ۲۳۔۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے۔

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (نساء۔۱۲)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انھوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (انعام۔۸)

اور جب تو ان کو دیکھے، کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں، تو ان سے کنارہ کرلے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ (نساء۔۲۰)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے، اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لیے ہیں تا کہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں۔

''میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو' لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو' نہیں تو تمہیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا' پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار' یا لالچی' یا بت پرست' یا گالی دینے والا' یا شرابی' یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا' بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا۔۔۔۔غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو (اول قرنیتوں ۵)

اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے' اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے' ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے' اللہ کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے ۔۔۔۔اس واسطے اللہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ اور جدا ہو' اور ناپاک کو مت چھوؤ (قرنیتوں ۶)

کفار ومشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل وانصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے' عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (توبہ ا)

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے' یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے' پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے' یہ اس لیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہوسکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک وکافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے' فرمایا۔

﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (لقمان ۲)

اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں' تو ان کی بات نہ مان' اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر' اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا' پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے' پھر میں تم کو جتاؤں گا' جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع:

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں ''منافقین'' کہتے ہیں' بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے' جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی در پیش ہو' اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں' وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلیں' یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں' اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے

مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آ جائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورہ توبہ میں ہیں۔

﴿ يَـاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا نَقَمُوْآ اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ (توبہ۔۱۰)

اے پیغمبر ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر، اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے، اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی، اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا، اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ پا نہ سکے، اور انھوں نے عیب نہیں کیا، لیکن یہی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولتمند کر دیا، تو اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے، اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا، اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں، اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین رکوع کے بعد سورۃ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں [1] کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے۔

﴿ يَـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (توبہ۔۱۶)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے ہم سرحد ہیں، اور چاہئے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں، اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہل بیت نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا۔

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ (تحریم۔۲)

اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر، اور ان پر سختی کر، اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن جریر، طبری ج ا ص ۴۶۔ مصر۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں' اور وہ سورہ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے۔

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (فتح ۴)

محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں' اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اشداء علی الکفار کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگدلی' بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں' بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت' استقلال' باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں' اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے' اس لیے محاورہ کے مطابق اشداء علی الکفار کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں' بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں' یعنی ان پر غالب' اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں' ان سے کسی طرح دبتے نہیں' چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں' ابن حیان اندلسی نے بحرالمحیط میں' قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں' جو سورہ مائدہ کی اس آیت کے ہیں۔

﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (مائدہ ۸)

فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے' اور بھاری ہیں کافروں پر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے' مثلاً سورہ ہود میں ہے۔

﴿ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (ھود ۸)

اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔

دوسری آیت میں ہے۔

﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ (توبہ ۱۶)

تمھاری تکلیف رسول پر گراں ہے

لسان العرب میں ہے۔

﴿ وَرَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِيٌّ وَالْجَمْعُ اَشِدَّآءُ ﴾ (جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ مصر)

مرد شدید' یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّةً اَشَدُّ خَلْقًا اَشَدُّ تَثْبِيْتًا اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے' اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے' دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں۔

﴿ اُشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ﴾ (طٰہٰ)
اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔
﴿ وَبَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ﴾ (نبا:۷۸)
اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔
﴿ وَشَدَدۡنَا مُلۡکَهٗ ﴾ (ص ۲)
اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔
﴿ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ﴾ (قتال ۱)
پھر مضبوط باندھو۔

شَدِیۡد کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے پھر اس سے انکار نہ کیا آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ ﴿ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ ﴾ (آل عمران وانفال) کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا، وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا ﴿ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ ﴾ (احزاب وحشر۔۱) ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے
﴿ وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ ﴾ (انفال ۸)
ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ یہ ہے کہ تمھارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمھارے مقابل آنے سے رعب کھائے اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرتؐ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے فرمایا جو شخص گھوڑا اللہ کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے اس کے لیے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لیے باندھتا ہے وہ اس کے لیے عذاب ہے"[1] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور اللہ کے لیے ہو لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے ناراضی:

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا' لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے' محبت اور عداوت' موافقت اور مخالفت' رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں' اور دنیا کے تمام کام' تمام تحریکیں' اور تمام جدوجہد' انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں' اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں' اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے' برف کا تودہ بن جائے' اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے' بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے' محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو' جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے' اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی' ذاتی خودغرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو' بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت' نیکی کی اعانت اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو' دوستی و دشمنی' رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو' وہ اللہ کے لیے ہو' الحب فی اللہ و البغض فی اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے' مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے' ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے' بلکہ جو ہو سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے' یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے' وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا' وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا' وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا' مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا' انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے' اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی' جیسا کہ قرآن نے کہا'

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ﴾ (احزاب ۱)

اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔ اسی مفہوم کو حضرت مسیحؑ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے

''کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا' اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا' یا دوسرے سے دوستی' یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا' تم اللہ اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے' (متی ۶۔۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے' پولوس [1] نے اللہ اور آدمی'

[1] گلتیوں کے نام (۱۔۱۰)۔

یعقوب [1] نے اللہ اور دنیا' یوحنا [2] نے اللہ اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا' وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کا ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے اپنی ذات کے لیے نہیں' بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ ''ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے'' عرض کی ''اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے'' فرمایا یہ کہ ''باہمی میل جول اللہ میں ہو' محبت بھی اللہ ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو اللہ ہی میں ہو'' مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ ''کونسی نیکی اللہ کو زیادہ پیاری ہے'' کسی نے نماز کہا' کسی نے زکوٰۃ کہا' کسی نے جہاد بتایا' آپ نے فرمایا ''تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اللہ کو یہ نیکی پسند ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے مخالفت ہو'' [3]

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں:

اللہ کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضمندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو' نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو' بلکہ دراصل اس کے افعال' اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو' اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں' قرآن پاک کی ایک آیت ہے۔

﴿ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ ﴾ (حجرات)
اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمھارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و ناراضمندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے' یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے' فرمایا۔

﴿ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ﴾ (توبہ۔۲)
تو اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں' اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے' اور ناراضمندی رضامندی سے بدل جاتی ہے' کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں' نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے' نہ ملیچھ ہے، نہ چنڈال ہے' نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے' اور نہ غیر قوم ہے' اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے' اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے

---

[1] یعقوب (۴۔۴)۔

[2] یوحنا (۲۔۱۵)۔

[3] مشکوۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ۔

گورے اور یورپین اور غیر یورپین کی تقسیم ہے‘ جو کچھ ہے وہ کفر وایمان اور شرک وتوحید کا فرق ہے‘ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل وابولہب ہوسکتا ہے‘ اور ایک معمولی حبشی وعجمی مومن وموحد ہو کر بلال حبشیؓ صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کا رتبہ پاسکتا ہے‘ وہی عمرؓ‘ وہی ابوسفیانؓ‘ وہی عکرمہؓ‘ وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے‘ بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے‘ اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے‘ اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے‘ اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا۔

﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران ۱۱)

(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے‘ تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل وکرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

ناپسندیدگی وبیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے‘ توبہ وندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت وشفقت سے مبدل ہو جاتا ہے‘ مبشر عالم نے ایسے گنہگاروں کو اللہ کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (زمر ۶)

اے میرے وہ بندو جنھوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے‘ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو‘ اللہ سب گناہوں کو معاف کرسکتا ہے‘ وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔“ یہی سبب ہے کہ آنحضرت نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا‘ اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی‘ ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی‘ وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے‘ ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑ آئے تو صحابہؓ نے کہا اللہ اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے‘ آنحضرت نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا ”تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو‘ مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔“[1] اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گنہگار پر بددعا نہ کی جائے‘[2] ماعز بن مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے‘ واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا‘ وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے‘ تاہم انھوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی‘ اور سزا کی درخواست کی‘ آنحضرت نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی‘ لوگوں سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہیں‘ سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے‘ اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا‘ وہ میدان میں کھڑے کئے گئے‘ اور ان پر سنگ باری کی گئی‘ اور اسی حال میں انھوں نے جان دی‘ صحابہ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو برا کہتے تھے‘ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا ”ماعز کے

۱۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

۲۔ فتح الباری شرح حدیث مذکور۔

لیے اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے' تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔[1]

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی' آپ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا' وہ اس کے بعد آئی' فرمایا بچہ کی پرورش کر لو' جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا' وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی' اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا' آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا' اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑیں' انھوں نے عورت کو برا کہا' آنحضرتؐ نے سنا تو فرمایا کہ "خالد چپ رہو' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔"[2]

ترک ہویٰ:

آنحضرتؐ کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے' کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض وغایت پر موقوف ہے' یعنی یہ کہ اگر وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے' اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیکی نہیں' اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے' ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہویٰ سے پاک رکھے' کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لیے وہ کام کرتا ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے' یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے' اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش و ہویٰ کے بت چھپے ہیں' قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا۔

﴿ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ﴾ (جاثیہ۳)

اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے۔

اسی لیے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعت محمدی نے ترک ہویٰ کا طریقہ پیش کیا' بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے' لیکن محمد رسول اللہؐ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے' کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی' اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا' اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں' بلکہ ہر بری خواہش' ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے' کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے' وحی محمدی نے فرمایا۔

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (قصص۵)

[1] صحیح مسلم کتاب الحدود۔
[2] صحیح مسلم کتاب الحدود۔

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (ص ۲)

اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے' وہ اسی ھوٰی کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے' فرمایا۔

﴿ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا ﴾ (نساء ۲۰)

عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے' جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا' وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا' اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے' فرمایا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ (نازعات ۲)

اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا' اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبت الٰہی:

دین ودنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے' خاص کر وہ محبت اور پیار جو اللہ کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو' یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے' ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے' عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیر عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے' مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے' اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے' مگر اصل سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے' اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے' اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے' مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے' اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا۔

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (آل عمران ۴)

کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو' تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اس لیے آنحضرت کی تعلیمات' ارشادات' احکام' اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے' لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے' بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ اللہ کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں' اور اس دولت سے محروم کون ہیں' اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو اللہ کی محبت کا ذریعہ ہیں' حسن خلق بھی ہے' اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے' بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (آل عمران ۷)

اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ (بقرہ۲۴ و مائدہ۳)

اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (بقرہ۲۸)

اللہ توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ﴾ (آل عمران۱۷)

اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴾ (مائدہ۶ حجرات۷)

اللہ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (توبہ۱)

اللہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ ﴾ (آل عمران۱۵)

اور اللہ صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ ﴾ (توبہ۱۳)

اور اللہ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ ﴾ (صف۱)

اللہ ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں' ایمان' احسان' توبہ' توکل' انصاف' تقویٰ' صبر' پاکیزگی' جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں۔

﴿ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ ﴾ (آل عمران۴)

تو اللہ کافروں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴾ (بقرہ۲۴)

اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴾ (نساء۶)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا' جو اترانے والا ہو، شیخی مارنے والا ہو۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ﴾ (نساء۱۶)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گنہگار ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ﴾ (انفال ۷)
اللہ خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ﴾ (حج ۵)
اللہ کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ﴾ (قصص ۸)
اللہ اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ (قصص ۸)
اللہ فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ﴾ (انعام ۱۷)
اللہ فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ﴾ (نحل ۳)
اللہ مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (شوریٰ ۴)
اللہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔
﴿وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ (بقرہ ۳۸)
اللہ ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر، غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرتؐ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا' اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا' اسی لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (بقرہ ۱۵)

وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک وصاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

﴿وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا﴾ (ابن ماجہ' باب فضل العلماء)

اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں' وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے' اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو' اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے' اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے' اور اس پر عمل فرماتے تھے' حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا' مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے۔[۱] قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی' بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی' تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتی تھیں' اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے حکام ٹال جاتے تھے۔[۲]

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں' نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا' اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا' صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے' آپ ﷺ نے روکا' اور فرمایا کہ تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو' اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں' یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں' یہ اللہ کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں' پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔[۳]

---

۱ صحیح بخاری باب قول النبی یسروا و لاتعسروا۔

۲ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

۳ صحیح بخاری کتاب الادب باب یسرو اولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کے پاس لے چلو، انھوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا دو مہینے لگا تار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اور جو بچے وہ تم اور تمھارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور نے کتنی نرمی کی۔[1]

یہ اور اسی قسم کے واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل ورذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ ﷺ نرمی سے سمجھا دیتے، اور لطف ومحبت سے فرما دیتے تھے۔

ع قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم الٰہی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمان الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (نحل ۱۳)

بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمھیں وہ نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز ودرماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون وچرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ، اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً اللہ کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے، جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کمثل حبة (بقرہ ۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے، اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا ونمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے، اور نہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن

[1] ابوداؤد باب فی الظهار۔

نے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ ۳۶) ''اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہوگئی اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ''جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔'' (نساء۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی ''کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔'' (حجرات ۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے ''جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔'' اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہوسکتی ہے۔ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آکر عدالت نبوی میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ''اس کو دیکھو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی آپ ﷺ نے پکارا کہ فلاں فلاں صاحب کہاں ہیں انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یارسول اللہ! فرمایا اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناونی بات ہے۔ [1]

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہوسکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا ''مسلمانو! شراب جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں شیطان کے کام شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔'' (مائدہ ۱۲) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا۔

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴾ (نساء۲۱)

---

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۸۵۔

اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللّٰہ گوصرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰه جَمِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالُ﴾ (صحیح مسلم و ترمذی)

اللہ جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس لیے بندوں کو بھی چاہئے کہ اپنے طور وطریق ولباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب ۳)

تمھارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ داری کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ سے دی گئی۔

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (ممتحنہ ۱)

تمھارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے، اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (بنی اسرائیل ۳)

بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی، جابر بن سلیمؓ ایک صحابی دربار نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجا لاتے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپ پر سلام (علیک السلام) آپ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، میں نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے، اور اس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے، اور جس سے تم جب کسی لق ودق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو

تمھارے پاس لوٹا دیتا ہے' میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے' ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو' جابرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام' یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا' آپ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ' اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمھارا چہرہ کھلتا رہے' یہ بھی نیکی ہے' اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو' اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے' کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے[1] اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا' اور اگر تمھیں کوئی گالی دے' اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے' تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ' کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا''۔[2]

اس طریقہ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے' کہ آپ ﷺ نے بدوی کو اللہ کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقع یاد دلائے جو اس کی زندگی میں اللہ جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے' اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا' اور حضور اقدس ﷺ سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی' ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے' یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے' یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں' حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی' اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو' پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیے' ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر' اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا' آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر[3] اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے' اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی' اس لیے آپ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا' جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا' اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی' لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے' فرمایا اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا' پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے' فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو' پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا تو کسی بیکس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کر دو' پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے' فرمایا کہ شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو (ادب المفرد بخاری صفحہ ۴۵ مصر)

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے' وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے' آپ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا' ایک دفعہ صحابہؓ سے آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو مفلس

۱۔ عرب امراء فخر و غرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی

۲۔ سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب والترمذی باب ماجاء فی کثرت الغضب۔

کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی' ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو نہ سامان ہو' فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز' روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا' لیکن کسی نے اس کو گالی دی ہوگی' اس پر تہمت لگائی ہوگی' اس کا مال کھا گیا ہوگا' اس کا خون بہایا ہوگا' اس کو مارا ہوگا' تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا' اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا' تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی' پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ [1]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو' لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں' فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے' پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ [2]

اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں' صبر کی تلقین کرنی تھی' تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو' صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو' فرمایا وہ بے اولاد نہیں' بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔ [3] (احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مرجائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بیٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں' بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے' اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا' پھر تیسری بار پوچھا' ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ فرمایئے' ارشاد ہوا' تم میں سب سے اچھا وہ جس سے اچھائی کی امید کی جائے' اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں' اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے' اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔ [4]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ ''مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے' اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں' ابو ہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول' ابو ہریرہؓ کہتے ہیں' کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا' پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں' گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے' اللہ نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولتمند ہو جاؤ گے' اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے' لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے' اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے۔ [5] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی

---

۱ صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم۔
۲ ایضاً باب فضل من یملک نفسہ عن الغضب۔
۳ ایضاً۔
۴ ترمذی شریف کتاب الفتن۔
۵ جامع ترمذی ابواب الزہد۔

رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا ''کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے' میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں''۔[۱] کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے' ان دو فقروں کی بلاغت پر غور کرو' دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے' جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے' اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں' جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں' ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے

ایک دفعہ فرمایا کہ کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے' میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں' آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو' چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔[۲]

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہوسکتا ہے' حجۃ الوداع میں آنحضرت منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا' لوگو! آج کونسا دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں' عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے' فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں' سب نے کہا جی ہاں' پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے' پھر سب چپ رہے' سمجھے کہ آپ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے' فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں' سب نے کہا جی ہاں' پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے' پھر سب خاموش رہے' کہ آپ کوئی اور نام بتائیں گے' فرمایا کہ یہ بلدالحرام نہیں ہے' سب نے کہا جی ہاں' ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون' مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمھارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن' اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔[۳]

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے' حضرت ابوذر غفاری گویا فطرۃً تارک دنیا تھے' بڑے ہی زاہد و عابد تھے' ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا اے ابوذر! جہاں رہو اللہ سے ڈرتے رہو' برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے' اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔[۴]

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے' آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا' تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا ''تمھارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے' اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے' کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے' کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے' راستہ سے پتھر' ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے' اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا

---

۱ صحیح بخاری باب حفظ اللسان۔
۲ مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵۔
۳ صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ۔
۴ ترمذی باب ماجاء فی معاشرۃ الناس۔

بھی صدقہ ہے۔[۱]

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے' چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی' بدکاری نہ کریں گی' اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی' بہتان نہ باندھا کریں گی' اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی (سورہ ممتحنہ ۲)

عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے' اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔[۲]

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے' اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا' آنحضرت ﷺ نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی ''ہم اللہ کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے' چوری نہ کریں گے' اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے' لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے' اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی' اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔''[۳] اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور ایک سوال کرتے تھے' سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے' مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں' خود ہی جواب دے دیتے تھے' دریافت فرمایا کہ افتراء کس کو کہتے ہیں' پھر خود ہی فرمایا وہ ''چغلی ہے' لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا''[۴] ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں'' لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے فرمایا ''تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو'' کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو' فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو ہو غیبت ہے' ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔[۵] ایک موقع پر ارشاد ہوا میں تمھیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ' فرمایا ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) گر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے' پھر فرمایا کیا میں تمھیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج' شیخی خور'

---

[۱] ترمذی فی صنائع المعروف۔

[۲] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸۔

[۳] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵' کتاب الدیات۔

[۴] صحیح مسلم باب تحریم التمیمة۔

[۵] صحیح مسلم باب تحریم الغیبة۔

مغرور۔ ۱؎

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا ''اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا'' صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یارسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔ ۲؎ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ''دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کس کے ساتھ، فرمایا ''اللہ کے ساتھ، اس کے کتاب کی ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ''۔ ۳؎

۱؎ صحیح مسلم باب جہنم۔

۲؎ مشکوۃ باب الشفقة على الخلق بحوالہ صحیحین۔

۳؎ مشکوۃ باب الشفقة على الخلق بحوالہ صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں' ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے' حقوق' فضائل ورذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں' اور یہ ان کے حقوق ہیں جنھیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے' یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے' اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے' مثلاً سچ بولنا' اخلاقی فضائل' اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے' اس کو آداب کہتے ہیں' مثلاً اٹھنے، بیٹھنے اور کھانے، پینے کا طور وطریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی:

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی' لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے' قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (بقرہ ۳)

اللہ نے تمھارے (کام) کے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے' ایک گونہ لگاؤ ہے' اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے' اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے' اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے' اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے' اسی ذمہ داری کا نام حق ہے' جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے' ارشاد ہوا۔

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (ذاریات:۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (معارج۔۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾ (بنی اسرائیل ۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

﴿ فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (روم۔۴)

تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے' تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے' ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے' یہ ان کا حق ہے' اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں' پھر غریب، پھر مسافر' ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے۔

﴿ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ (انعام ۱۷)

اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو' اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا' اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے' اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے' اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی' اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

﴿ انّ لزوجك عليك حقاً و لزورك عليك حقاً﴾ (بخاری' صوم)

تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

﴿ و لا هلك عليك حقاً﴾ (بخاری صوم)

تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے' کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔ (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں' بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے' اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ فان لنفسك عليك حقاً﴾ (بخاری' صوم)

بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

﴿ فان لجسدك عليك حقاً و لعينيك عليك حقاً﴾ (صحیح بخاری کتاب الصوم)

تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے' اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے

حقوق کی وسعت:

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے' تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے' جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے' نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے' حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام وآسائش کا خیال کیا جائے' اور انسانوں

سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے او پر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائنات ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیح مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں، ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشو و نما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے، اور اس کے مناسب غذا سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (بقرہ۔۳)

زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کے لیے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیے وہ بنائی گئیں، اور اس لیے تاکہ وہ وقت مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ "ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتہً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں[1] میں تو کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔" اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے"[2] اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے۔[3] ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔[4]

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی بیان کئے گئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ

۱۔ صحیح بخاری باب الحرث و المزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲۔

۲۔ صحیح بخاری مسلم باب مذکور۔

۳۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکورہ جلد خاص صفحہ ۷ مصر۔

۴۔ یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں۔

کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب:

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ وانجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ''محبت کرنا'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہئے جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو''۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے، اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلیمات کی تدریجی ترتیب کی بحث آ جاتی ہے، جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے، اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی، اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔[2]

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان و حیوان کے، اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے، اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری

---

[1] صحیحین کتاب الایمان۔

[2] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ۔

ہو جاتی ہے مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے ایک غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے پھر اسی حالت میں اس کا ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی مدد کرنی چاہئے یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں پھر باپ کے ہیں پھر بھائی کے ہیں پھر پڑوسی کے ہیں پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ (نساء۔۲)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ داروں پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۲۶)

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

اور رشتہ دار کا حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:۔

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو'' (خروج ۲۰۔۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے۔

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے'' (احبار ۱۹۔۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ:

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے'' (احبار ۲۰۔۹)

''اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا'' (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعلیم نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:۔

''کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا'' [1]

نبوت محمدی جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے اس نے تورات وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱۔ اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اسکی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ﴾ (لقمان:۲)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اسکی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ﴾ (احقاف:۲)

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اسکی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا، تیرا باپ۔ [2] ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور

۱؎ اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹۔۱۹ مرقس ۷۔۱۰، ۱۰۔۱۹ الوقا ۱۸۔۲۰)۔

۲؎ صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب۔

فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔[1] ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا خالہ ہے؟ گزارش کی، ہے، فرمایا "تو اس پر نیکی کر" [2] یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔ [3]

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنس لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا پھر اس نو پید امضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعت محمدی نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اسکی سزاوار ہے۔

۲۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اسکی نشو و نما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی "عزت" کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت ان کی امداد اور ان کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر تعلیم، توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا۔

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (بقرہ: ۱۰)

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب۔

[2] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

[3] ترغیب و ترتیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ، نسائی، حاکم۔

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آ گئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزم کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔ اسی سورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (بقرہ:۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کیلئے

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے۔

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ (نساء:۶)

اور اللہ کو پوجو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمیں وخیالی باتیں پیدا کر لی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا۔

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ (الانعام-۱۹)

کہہ (اے پیغمبر!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کیساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا۔

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ο وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل-۳)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو، اور نہ ان پر خفا ہو، اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ، اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو

ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا۔

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (عنکبوت:۱)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف انکی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَّفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ o وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴾ (لقمان:۲)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کیساتھ نیکی کرو۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو انکا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کیساتھ بھلائی سے گزران کر۔

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں انکا ادب انکی اطاعت اور انکی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً انکی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسنِ خاتمہ پر مرے۔

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (ابراہیم:۶)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی۔

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (نوح:۲)

میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لیے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجا لاتے ہیں اور ان کے لئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو

عطا فرماتا ہے۔

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَّحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ط حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ط إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾ (احقاف:۲)

اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اسکی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پرودگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول، اور ان کے برے کاموں سے درگزر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہونگے یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے''[1] کبھی ارشاد ہوا ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے''۔ کسی نے پوچھا یارسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گزارش کی پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا، تیرا باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔ ایک دفعہ حضور انور ﷺ مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے فرمایا وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہ نے پوچھا کون یارسول اللہ! ارشاد ہوا، وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا (جہاد)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد، ونسائی، وبیہقی، کتاب الادب فی البر والصلہ۔

نے کہا بار الٰہی تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دھو کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گزاری کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، اسی لیے ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آکر خدمت اقدس میں شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ "تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے"۔ ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ! فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی"۔ [1]

توراۃ میں حقوق والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے۔ وحی محمدی نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں خصوصیت کے ساتھ دیکھو بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلہ، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ مشکوۃ باب مذکور۔

ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا آنکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔[1]

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے (پیدائش ۲۔۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرفداری اور حمایت کی، اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰۔۷۔۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو، اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے، اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت ﷺ نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔

❁❁❁

---

[1] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل وقرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اولاد کا حق

اصول تعلیم:

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں‘ اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں‘ اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا‘ اور اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے‘ مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا‘ اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا‘ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں‘ وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے‘ اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے‘ آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے‘ ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے‘ یہ متن ان سب پر محیط ہے‘ فرمایا۔

﴿لَیْسَ مِنَّا من لم یرحم صَغِیْرَ ناوَلَمْ یوقر کبیْرَنا﴾ (ترمذی)

جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے‘ اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں‘ اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں‘ یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے‘ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں‘ بڑوں‘ افسروں‘ ماتحتوں‘ آقاؤں‘ نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے‘ جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں‘ اور دیتے ہیں‘ اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانون کا بار گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں‘ بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں‘ یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے‘ اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے‘ اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد:

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا‘ اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا‘ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے‘ اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب

تھے' ایک تو مذہبی تھا' یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے' منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچہ [1] کی قربانی کریں گے' یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی' رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا' اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی' اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا۔ [2] اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے' اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا' اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں' قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے۔ [3]

﴿ وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴾ (انعام ۱۶)

جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں' تا کہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیے) ہلاک کر دیں' اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں' اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے' تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ اللہ پر افترا کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر اللہ فرماتا ہے۔

﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْآ اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا' بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (انعام ۱۶)

گھاٹے میں ہیں وہ جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا' وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہو گی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہو گا' اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے' نبوت محمدی نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے' ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا' بلکہ وہ اللہ ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے' اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے۔

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (هود ۱:۱۱)

اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض اللہ ہی پر ہے۔

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام' و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ' نیز موطا امام مالک باب مالا یحوز من النذور فی معصیۃ اللّٰہ۔

[2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۳۰۔

[3] کشاف زمخشری تفصیل آیت ذیل۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ﴾

(اسراء۔۱۷)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ﴾ (انعام۔۱۹)

کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے؟ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد فرمایا یہ کہ "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی"۔[1] یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، الٰہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتو فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کردیا کہ رازق اللہ ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگئی۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کردینا تھا کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور اللہ کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ (زخرف۔۲)

اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردہ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکر کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورۂ بقرہ، و سورہ فرقان، و کتاب الادب و کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ﴿ (نحل۔۷)

اور جب ان میں سے کسی کولڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے' اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے' اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)

یوں تو اس رسم بدکا رواج تمام عرب میں تھا' مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا' [1] بنوتمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے' [2] یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے [3] کہ ایک شخص نے آ کر خدمت اقدس میں عرض کی کہ ''یارسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے' بتوں کو پوجتے تھے' اور اولاد کو مار ڈالتے تھے' میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا' اور لڑکی اس کے قریب پہنچی' تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا' وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی' اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی، رحمت کونین ﷺ اس پُر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط نہ کر سکے ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا' فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے' پھر ان صاحب سے فرمایا' ''ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ'' انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی' پھر فرمایا'' جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے' اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔''

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔ فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو۔ عرض کی یارسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں' فرمایا ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو''۔ [4]

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں' مائیں خود اپنی

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۸۷ مطبعہ خیریہ مصر زیر مثل اضل من موؤدۃ۔

[2] ابن جریر ابن کثیر و در منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و سند بزار، مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۃ تکویر۔

[3] سنن دارمی صفحہ اول' یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں' لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آ جائے۔

[4] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزار و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۃ الشمس کورت۔

لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں' ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے۔

مالقی الموؤدمن ظلم اُمِّہٖ کمالقیت ذھل جمیعاً و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذھل[1] اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی' فرمایا ''ایسا نہ کرو' بلکہ کفارہ دے دو''

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی' چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا' اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے' کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا' فرمایا! ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا' کہ اللہ نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔ [2] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیمی کے پیرو تھے' وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوش شفقت میں لیتے تھے' اور ان کی پرورش کرتے تھے' جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں' چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو' [3] یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہوئیں' لیکن بعثت محمدی کی رحمت عام کی جب بہار آئی' تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے' نبوت محمدی نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں' فرمایا'' جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی' وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی'' [4] نیز فرمایا'' جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں' تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا'' [5] غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی' عہد محمدی میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی' صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں' ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (ممتحنہ) کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی''۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت نے عورتوں سے خصوصیت کے

---

۱ موطا امام مالک باب النبی عن النذر فی معصیۃ اللہ

۲ تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی۔ تفسیر اذا الشمس کورت

۳ صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰

۴ صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر

۵ مشکوۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی شفقۃ علی الخلق۔

ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انھوں نے اقرار کیا، [1] عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے، اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد [2] لیا کہ وہ قتل اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربار رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد [3] لیا جاتا تھا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھی، ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔'' [4]

حضرت عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ اللہ پر ہے، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا، اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو اللہ کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے''۔ [5] صحابہ سے فرمایا کہ ''اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے''۔ [6]

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصری آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں۔

﴿ وَاِذَاالْمَوْءٗ دَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴾ (تکویر)

یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶ تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء

[2] صحیح بخاری جلد اول ص ۱۳۳ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید

[3] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمی بنت قیس

[4] تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۴۴۳ بر حاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۴۲۴ علی شرط مسلم

[5] صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸

[6] صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل۔

کہ یہ تو تمہارے چچا کی بیٹی ہے' حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے' اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے' حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے' حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے' آنحضرت ﷺ اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں' پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کے گود میں دے دیتے ہیں کہ ''خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔'' [1]

کیا یہ وہی جنس نہ تھی کہ جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی' جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا' اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا' اب یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعتہً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں' اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے' وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی' آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (فرقان۔۶)

(جنت ان کو بھی ملے گی جو) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا۔

﴿ غدا النّاس مذقام النبی الجواریا ﴾

پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت وحضانت:

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے' اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے' اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی' اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے' چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے' تنہا باپ پر رکھا ہے' رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے' مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے' اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا' اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے۔

﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (بقرہ۔۳۰)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں' یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے' اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء۔

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا' اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے' فرمایا

﴿ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ (نساء۔۴)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا' اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو ونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے' اور باپ نہ ہو تو دادا پر' اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم و تربیت:

ظاہری اور جسمانی نشو ونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے' قرآن پاک نے ایک مختصر سے فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے' اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے' کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں' فرمایا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ (تحریم۔۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے' یہ آگ جہنم کی آگ ہے' مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں' خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے' جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں' اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت' دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ "بارالٰہی! تو ان کو ظاہر و باطن کا حسن' صورت و سیرت کی خوبی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا' فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (فرقان۔۶)

اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرمایا۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے' ایک سورہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں' اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں' اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا

کرتے ہیں۔

﴿ وَ اَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَاِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴾ (احقاف۲)

اور (اے اللہ!) میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا' اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا:

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی میں آیا' حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے' اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی' اس نے کہا کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں' میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا' حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی' پھر فرمایا' جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا [۱] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں''۔

[۲] ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہئے' کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی' اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں' اس وقت کا شانہ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا' ام المومنین ؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔ ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سد رمق سے محروم رکھے' اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا' حضرت عائشہ ؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا' آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا' حضور نے سن کر فرمایا ''جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی''۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہو گا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے''۔ [۳] اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے' ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ [۴]

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے' ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو' اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے' اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ

---

[۱] یہ روایت صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں' نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔

[۲] یہ روایت صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں' نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔

[۳] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات۔

[۴] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔

اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔[1] باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی میں قائم نہیں' اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں' کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے' یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو' تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا' ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا' اور چاہا کہ اس پر آنحضرت کی شہادت ہو' انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی' دریافت کیا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے' عرض کی نہیں' فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔[2]

اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں' رومیوں' ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے' یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو' اصلاح کر دی گئی' اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا' اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الولد۔
[2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ' اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا' اسی طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش ومسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے' ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقی مدارج کے لیے عائق ومانع تسلیم کیا گیا تھا' ہندوستان میں بودھ' جین' ویدانت' جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے' عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا' اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا' اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدر جہا تعلق از دواج میں ممکن ہے' کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے' جو کسی کا شوہر نہ ہو' جو کسی کی بیوی نہ ہو' جو کسی کا باپ نہ ہو' جو کسی کی ماں نہ ہو' جو کسی کا بھائی نہ ہو' اور نہ کسی کی بہن ہو' نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے' اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے' اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے' مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے' اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر وبرکت کا سبب قرار دیا' حکم ہوا۔

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (نور۴)

اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحین کا نکاح کر دیا کرو' اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا' اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب وتنگدست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر وبرکت کا ذریعہ ہے' مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہو گی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو' تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا' اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے' ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے' اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے' اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں' غریب ہی سمجھ سکتے ہیں' خصوصاً مزدور اور کاشتکار' دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے' اس لیے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہو گا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے' خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کر دے گی' جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہو سکتا' آخر میں فرمایا کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے' اس کی

گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے غیب کا علم اسی کو ہے اس لیے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے فرمایا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ﴾ (نساء۴)

اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کرسکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نومسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہوسکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور اللہ کے نزدیک قبول ہے دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم مرتبہ کیسے ہوں گی تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا

﴿ اتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني ﴾ [1]

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن و شو کے باہمی اخلاص و محبت کو اللہ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے فرمایا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (روم۳)

اور اس (اللہ کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کردیا بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہئے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے اللہ نے اس زن و شوہر کے تعلق کو اپنے عجیب و غریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر و محبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے جو زن و شو کے باہمی میل جول اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں، فرمایا۔

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۔ ۔ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (بقرہ۱۲)

تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔۔۔۔۔اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے، کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے، اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے، اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (نساء۶)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے، اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں، کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں، اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (بقرہ۱۲)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں، اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں،

اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے' فرمایا

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهِ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴾ (نساء۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا' اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا' اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا' اس اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو' اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو' اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے' ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے' جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے' اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا' اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں' غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے' یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا' اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود میں آیا ہے' اور اس نقطہ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے' کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودّت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو' قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے' مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (مائدہ۱) ''پاکدامنی کے لیے' نہ شہوت رانی کے لیے'' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا ''اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو' وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی' اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے' کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے (ابن ماجۂ نکاح)

نکاح کے ان اغراض کو پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایاں رہے' اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو' باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہئے' اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہئے' اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے' فرمایا' ان ارادوا اصلاحاً' (بقرہ ۲۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں' وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا (نساء ۱۲۹) اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو۔ کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے۔

﴿ اَنْ يُّقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۲۹)

یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے' اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں' مجبور ہیں' محمد رسول اللہؐ نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو

فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ ۲۸)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ' کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے' اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں۔

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (نساء۔۲)

تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں' اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں' ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے' پوری نگرانی رکھیں' اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت و آبرو ہے' شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں' مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض' اطاعت' سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں' حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں' کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے' شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کر دے' اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے"۔ (ابن ماجہ نکاح)

زن وشو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی

"لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں' تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے' لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں' اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو' اور ان کو ہلکی مار مارو' تو اگر تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو' بیشک تمہارا عورتوں پر' اور عورتوں کا تم پر حق ہے' تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے' اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں' اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔ (ابن ماجہ' کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے' فرمایا! جب خود کھائے تو اس کو کھلائے' جب خود پہنے تو اس کو پہنائے' نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے' نہ اس کو برا بھلا کہے' اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے (ابن ماجہ' ایضاً) دوسری طرف آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں' یہاں تک فرمایا کہ "اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے

شوہر کو سجدہ کرے'' آپ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

﴿ خیر کم خیر کم لا ھله﴾ (ترمذی ودارمی وابن ماجہ)

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

﴿ خیار کم خیار کم لنساء ھم﴾ (ترمذی[1])

تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہیں۔

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے' جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے' کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے' لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے' آنحضرت نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا۔

﴿ و لزو جك علیك حقاً﴾ (بخاری' کتاب النکاح)

اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی' وہ ہر وقت معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جاسکتی تھیں' حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا' پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار قطار میں نہیں سمجھتے تھے' اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے''۔[1]

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا' اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا' البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی' ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ (بقرہ۔۲۸)

اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر' اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے' یہ اس لیے ہے تا کہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں' یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں' یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے' گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے' تا کہ وہ اپنے گھر کے نظام کو

[1] صحیح بخاری باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورہ التحریم۔

اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں، فرمایا۔

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ (نساء۔۶)

مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور اس لیے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے'' [1] آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی''۔ [2] یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (نساء۔۳)

اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بار گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور

---

[1] صحیح بخاری ومسلم نکاح۔
[2] صحیح بخاری مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔

بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے، اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے[1] اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر عرض پرداز ہوئی کہ یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا "تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو"۔ [2]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے فرمایا "تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی۔ مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" (بخاری اول ۷۷۹ باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے؟

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے۔

﴿ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ﴾ (نساء۔۶)

اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ، اور خوابگاہوں میں ان سے علیحدگی برتو، اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔

لغت میں "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہیں، اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

﴿ و معنى ذالك اذا رأيتم منهنّ ما تخافون ان ينشزن عليكم من نظرالى مالا ينبغى لهنّ

---

[1] اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں تفصیلات کے لیے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر۔

[2] صحیح بخاری باب اذالم ینفق الرجل صفحہ ۸۰۸۔

ان ینظرن الیه و یدخلن و یخرجن و استر بتم[1] بامرهن﴾ (تفسیر طبری ۵۔ مصر ۳۸)
اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ''نشوز'' کا ڈر ہو یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہئے' اور وہ آئیں اور نکل جائیں' اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔

﴿عن محمد بن کعب القرظی اذارای الرجل تقصیرها فی حقه فی مدخلها و مخرجها قال یقول لها بلسانه قد رایتك منك كذاو كذا فانتهی﴾ (ایضاً)
محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے' تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی' یہ دیکھی تو اب باز آ جا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے۔

﴿الناشزة هی الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه﴾ (عالمگیری نفقات)
نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے' اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے' اس سے بے رخی کرے' اور اس سے بغض رکھے (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں' اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں' آیت مذکور پوری یہ ہے۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ (نساء ۶)
مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے' اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں' تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں' اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت[2] و آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں' کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے' اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ' اور ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کر دو' اور ان کو مارو' تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں' ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں' اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں' اس کے بعد ہے کہ

۱۔ اصل متن تفسیر میں واستبربتم غلط چھپا ہے

۲۔ اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجراء قاضی کا فرض ہے۔

اب جس عورت سے تمہیں ''نشوز'' کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ' نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر یہ بتایا جا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے' پھر یہ بھی کہا جا سکتا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں' اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار' مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں' اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کرو' اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں' یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت' جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے' اور ایسی ہی عورت کو تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

''شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت'' کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے' اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے' آپؐ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے' اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے' اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے' اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں' ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم میں ہے۔

﴿ واتقوا اللّٰہ فی النساء فانھن عندکم عوان ولکم علیھن ان لا یوطین فرشکم احداً تکرھونہ فان فعلن فاضربو ھن ضرباً غیر مبرح ﴾ (مسلم)

عورتوں کے بارہ میں اللہ سے ڈرو' کہ وہ تمہارے بس میں ہیں' تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں' جس کو تم ناپسند کرتے ہو' اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں۔

﴿ استوصوا بالنساء خیرا فانھن عندکم عوان لیس تملکون منھن شیئاً غیر ذلك الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن فاھجرو ھن فی المضاجع واضربو ھن ضرباً غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلاً ﴾ (کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں' تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں' مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں' تو اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کر دو' اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو' تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ''کھلی بے حیائی'' سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں' لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع

کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشة مبینة کی تفسیر میں داخل کیا ہے (تفسیر سورہ نساء رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے، اور شرح کی تصریح ہے کہ یہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے (تفسیر طبری جلد ۵ صفحہ ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آ سکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ "اللہ کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو"، تو حضرت عمرؓ نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا "آل محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں" (ابوداؤد وابن ماجہ ودارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا"۔[1] یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے، اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا "تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو"۔[2] ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو"۔[3]

❁ ❁ ❁

---

۱ صحیح مسلم المطلقة ثلاثا۔

۲ مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد۔

۳ مشکوۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ صحیح بخاری ومسلم۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ''صلہ رحم'' ہے، محمد رسول اللہ کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحی محمدی میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا۔

﴿ فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (روم۔۴)

تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر۔

﴿ وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (اسرائیل۔۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت، اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ کی مرضی کے لیے تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى ﴾ (بقرہ۔۲۲)

(اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا۔

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى ﴾ (بقرہ۔۱۰)

(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

سورہ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى ﴾ (نحل۔۱۳)

بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ ﴾ (بقرہ۔۲۶)

کہہ دے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ ﴾ (نور۔۳)

اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔

اللہ کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہل قرابت کے ساتھ نیکی ہے' فرمایا۔

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (نساء۔۶)

اور اللہ کی عبادت کرو' اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلامؐ اپنی ان تمام محنتوں' زحمتوں' تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت' تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل' معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں' کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ' فرمایا۔

﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ (شوریٰ۔۳)

کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں' اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں' کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے' کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و امانت کی اصلی گرہ ہے' یہ اشتراک کہیں' ہم عمری' کہیں ہم درسی' کہیں ہمسائیگی' کہیں ہم مذاقی' کہیں ہم پیشگی' کہیں ہم وطنی' کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے' اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت' اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے' لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے' جس کا موطن رحم مادر ہے' یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے' جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے' اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحی محمدی نے ''فاسق'' کا خطاب دیا ہے' اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (بقرہ۔۳)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے، جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں' اور اللہ نے جس کے جوڑنے کو کہا' اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے' اس لیے محبت والے اللہ نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ''جس نے تجھ

کو ملایا' اس کو میں نے ملایا' جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا'' [1] اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت نے یوں ادا فرمایا کہ ''رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے''۔ [2] ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا' ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے اللہ کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا' اللہ نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا' کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں' جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں''۔ [3] یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک' محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے' اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے' سورہ نساء میں فرمایا۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ﴾ (نساء۔۱)

اور جس اللہ کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت سے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے' فرمایا اللہ کی بندگی کرو' کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ' نماز پوری طرح ادا کرو' زکوٰۃ دو' اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔ [4]

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ''جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا'' (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا' جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لے گا' یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے' کہ ''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے'' [5] اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں' ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے' دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے' پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی' اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی

---

[1] صحیح بخاری' کتاب البر والصلۃ۔
[2] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ۔
[3] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ۔
[4] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم۔
[5] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم۔

صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جا سکتی ہے' انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال' تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں' لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں' ان کی زندگی میں خانگی مسرت' انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے' جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے' ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے ''صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت' مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے''

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے' اس کے ساتھ صلۂ رحم [1] کیا جائے' یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں' ان کا حق ادا کیا جائے۔

❁❁❁

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں، انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اور دن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو، اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا، اور اس لیے اس کی خاطر لڑ نے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔

وحی محمدی نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے، اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے۔

﴿ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ ﴾ (نساء۔۶)

(اور اللہ نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)

اس ''قریب'' اور ''بیگانہ'' کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ ''قریب کے'' معنی رشتہ

دار و عزیز اور ''بیگانہ'' کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں' دوسرے کی رائے ہے کہ ''نزدیک'' کے معنی ہم مذہب کے ہیں' اور ''دور'' سے مطلب دوسرے مذاہب والے ہیں' جیسے یہودی' عیسائی' مشرک وغیرہ'[1] لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے' تعلیم محمدی کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی' جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو وہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو' یا ہم مذہبی ہو' یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو' بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی' سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا' ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے' کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا ''اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا' اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا' اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا''۔ جان نثاروں نے پوچھا ''کون یا رسول اللہ''! فرمایا ''وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں''۔ [2] ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے''۔ [3] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''جو شخص اللہ اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے''۔ [4]

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا' ارشاد فرمایا ''اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے' اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے'' [5] ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ ''جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں''۔ [6] حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے' آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے' اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں'' فرمایا ''جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو''۔ [7]

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں' بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں' کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو' اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو' اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو

---

۱ ابن جریر طبری' تفسیر آیت مذکور۔
۲ صحیح بخاری کتاب الادب الاثم من لایامن جارہ بوائقہ۔
۳ صحیح بخاری کتاب الادب۔
۴ صحیح بخاری کتاب الادب۔
۵ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حق الجار۔
۶ صحیح بخاری کتاب الادب۔
۷ صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب۔

نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو' اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔'' ؎۱

ان تحفوں کے بھیجنے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے' اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھری ہی کیوں نہ ہو''۔ ؎۲ یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے' یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے' اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔'' ؎۳

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو' اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو' لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی' تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے' بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے' مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے' بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے' مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں' اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے' اسی لیے توراۃ میں یہ حکم تھا۔

''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے' تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر' تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر''۔ (خروج ۲۰۔۱۷)

''تو اپنے پڑوسی سے' دغابازی نہ کر' نہ اس سے کچھ چھین لے''۔ (احبار ۱۹۔۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبرؐ کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی' جن میں تورات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے' بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا' ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

''زنا حرام ہے' اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے' لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے' چوری حرام ہے' اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے' لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے''۔ ؎۴

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں' دن کو روزے رکھتیں' صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں' مگر زبان کی تیز تھیں' زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں' لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں' ان کو دوزخ کی سزا ملے گی' پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ

؎۱ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجوار

؎۲ صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا

؎۳ مشکوٰۃ از بیہقی وادب المفرد امام بخاری باب لایشبع دون جارہ۔

؎۴ ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔

دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں؛ فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو (مرقس ۱۲۔۳۰)

آنحضرت نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے"۔[۱]

"اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔[۲] اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے،[۳] انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا، فرمایا: جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو، اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔[۴]

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہ عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقت حال بتائی، سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کہ وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا، اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا۔[۵]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جارہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی۔[۶]

---

۱ ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ۔

۲ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۳ مشکوٰۃ از بیہقی۔

۴ احمد بن حنبل، مسند عقبہ بن عامر۔

۵ ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار۔

۶ موطا امام مالک باب ماجاء فی اکل اللحم۔

﴿ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ط اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ﴾

(احقاف ۲)

اور جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے۔[1]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب باب حق الجوار۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے' اس کو پیار کرے' اس کی ہر طرح خدمت کرے' اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے' اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے' عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے' یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی' مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا' وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے' کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے[1] اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا' قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے۔

﴿ اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ﴾ (ماعون)

کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے' سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے' جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

﴿ کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (الفجر۔۱)

نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو' اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کے ریجھے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے' توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے' کہ "شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں" (استثنا ۱۴۔۲۹ و ۲۶۔۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے' اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے' اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا' وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا

﴿ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۔۔۔۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴾ (الضحیٰ)

کیا تجھ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا' تو اس نے پناہ دی۔۔۔۔۔ تو یتیم کو نہ دبا۔

آنحضرتؐ جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے' اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بیکس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے' چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں' دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا' کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے'

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری' سورۂ نساء ج ۴ ص ۱۷۰۔

اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

﴿ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ o یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴾ (بلد۔۱)

یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ داریتیم کو کھلانا۔

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا، کہ یہ وہ ہیں جو

﴿ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا ﴾ (دھر۔۱)

اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورہ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا، اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بد دیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا۔

﴿ وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ﴾ (نساء۔۱)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دیدو، اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو، اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

دولتمند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے، اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا۔

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (نساء۔۱)

اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔

یتیم بچوں کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے، اور نہ جب تک ان کو پورا شعور آئے، وہ ان کے سپرد کیا جائے، بلکہ ان کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے فرمایا۔

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا o وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾ (نساء۔۱)

اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نہ پکڑا دو، اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو، اور ان سے معقول بات کہو، اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو نا سمجھ یتیموں

کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ ''تم ان کا مال ان کو واپس کر دو''۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں، متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضہ نہ کر بیٹھیں، اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی۔

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ﴾ (نساء۔۱)

اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحب جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں، تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی۔

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (نساء۔۱)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہئے کہ بچتا رہے، اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی۔

﴿ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ﴾ (نساء۱۹)

اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔

سورہ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ (انعام۔۱۹)

اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورہ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے، اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے (سورہ اسراء۴)

یہ تو صاحب جائداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب و مفلس ہوں، ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار باران کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْن خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا'' میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو

انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے" [1] یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے، اور اس کو کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو" [2] نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے، اور سب سے بدتر گھر وہ ہے، جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو"۔ [3]

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے، اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا" [4] بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول فاطمہ ؓ بقول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے، [5] حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اپنے خاندان [6] اور انصار [7] وغیرہ [8] کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ [9]

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانتداری برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا، اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو، اللہ تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابوالدحداح صحابی حاضر تھے، انھوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انھوں نے فوراً بدل دیا، اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔ [10]

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا محمد رسول اللہ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ

---

[1] صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیما و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم۔
[2] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح)۔
[3] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳ بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیما۔
[4] صحیح بخاری باب عمرۃ القضا۔
[5] ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس۔
[6] موطا امام مالک کتاب مذکوۃ و زکوۃ اموال الیتٰمی و زکوۃ الحلی و کتاب الطلاق۔
[7] مسند احمد جلد ۶ ص ۲۶۹۔
[8] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ ص ۳۲۔
[9] ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیما۔
[10] استیعاب ابن عبدالبر تذکرۂ ابوالدحداح۔

کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادیں وقف کیں [1] اور دنیا میں ایک نئے ادارے کی طرح ڈالی، اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں، [2] اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے، اور لندن کے لارڈ میر یا آرفس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

---

[1] تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔

[2] حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنس لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے' اب وہ بے یار و مددگار اور بے مونس و غمخوار ہیں' نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے' عورت جس کو اللہ نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا' اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی' اب وہ ناچار ان سے دوچار ہے' اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے' بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں' اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں' دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی' وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا' عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا' عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا' مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کر سکا' ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی' اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مر جانا چاہئے' اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گذار دے' عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی' اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے' اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے' اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادرسی ہوئی' اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا' اور صرف اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں' اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی' اور اس کا نام عدت رکھا یعنی ''شمار کے دن'' اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی' اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا' پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا' عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی' اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع و قمع کر دیا' اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے' اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے' اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے' اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے' وہ اس کو پھر عطا کیا جائے' قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا۔

﴿ وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ ﴾ (نور۴)

اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے' بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی' اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے' آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی' اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا' ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کئے' جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں' جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا' اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا' قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے' وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا باآسانی کر سکتا ہے' فرمایا۔

﴿ السَّاعی علی الارملة والمسکین کا لسَّاعی فی سبیل اللّٰه واحسبه قال کا لقائم لا یفتر و کالصائم لا یفطر ﴾[1]

بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے' جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا' اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

﴿ الساعی علی الارملة والمسکین کا لمجاهد فی سبیل اللّٰه و کالذی یصوم النهار و یقوم اللیل ﴾ (کتاب الاداب)

بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے' اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں' اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں' جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں' اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں' یہ فرمایا ''میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے' وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم موطا امام مالک بحوالہ مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں"۔[1] اسی مقصد کو ابویعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے، تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے"۔[2]

❁ ❁ ❁

[1] سنن ابوداؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

[2] حاشیہ سنن ابی داؤد بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نورالدین پنجابی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے۔

﴿ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴾ (ذاریات۔۱)

اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔

﴿ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴾ (معارج۔۱)

اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو محروم کی تشریح میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو اسی معنی کی تائید اہل لغت اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک سے ہوتی ہے۔[1]

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق "حق" کا بیان ہے مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق "حق" کا نہیں بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے۔

﴿ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴾ (ضحیٰ۔۱)

اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔

یہاں "سوال کرنے والے" کے معنی اغنیٰ کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم المحارف اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورہ قلم میں اصحاب الجنہ کے فتنہ میں محرومون اور سورہ واقعہ میں بل نحن محرومون کے معنی۔

مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو خواہ وہ جسمانی ہو مالی ہو علمی ہو۔ [1] یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴾ (نساء ۱۱)

جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا ایسا ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (مائدہ آیت ۵:۲)

اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور ڈرو اللہ سے بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

﴿ مَنْ كَانَ فِيْ حاجة اخيه كانَ اللّٰهُ فی حاجته ومن فَرَّجَ عن مُسْلِم كربة فَرَّجَ اللّٰه عنه كربة من كربات يوم القيامة ﴾ (صحیحین)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا۔

﴿ واللّٰه فی عون عبده ما كان العبد فی عون اخيه ﴾ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)

---

[1] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے واما من سائل من ذی حاجة فلا تنهر زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالبعلم لیا ہے۔

اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔[1] ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو[2] یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔[3] یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔[4]

❁❁❁

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ۔

[2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ۔

[3] ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

[4] ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے، اور اس فرض کا نام عربی میں ''عبادت'' ہے۔[1] ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں، یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے، اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنا دیا ہے۔

﴿ وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (نور-۸)
اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (فتح-۲)
نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى ﴾ (توبہ-۱۲)
نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ-۲) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں، عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) (مزمل-۲) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا (تو تم میں جو بیمار ہو) (بقرہ-۲۴) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر

---

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے۔

ذهب الرقاد فما يحسس رقاد مما شجاك وفامت العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

نماز کی رخصت دی گئی‘ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب اللہ نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہئے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے‘ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے‘ اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں‘ اور وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ [۱]

آنحضرت نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے‘ اس کے آداب تعلیم کئے ہیں‘ اس کی دعائیں سکھائی ہیں‘ اور اس کا ثواب بتایا ہے‘ فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا اللہ اس [۲] کے غم کو ہلکا کرے گا‘ اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں‘ جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے‘ [۳] صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا‘ جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ [۴] ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں‘ اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں‘ [۵] یہ بھی آیا ہے کہ ”جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے“۔ [۶] فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسا دے اور اس کو شفا پانے کے لیے اللہ سے دعا کرے۔ [۷] آنحضرتؐ اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے‘ بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی‘ آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔ [۸] منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں‘ [۹] اور اسی سے علما نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔ [۱۰]

---

۱ صحیح مسلم باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ وسنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔
۲ ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم۔
۳ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔
۴ ایضاً۔
۵ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔
۶ صحیح مسلم باب عیادۃ المریض‘ بطریق مختلفۃ۔
۷ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔
۸ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔
۹ ایضاً۔
۱۰ مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا' تاکہ بار بار ان کی عیادت کی جاسکے۔ [۱] رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں' ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا' تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ [۲] غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ [۳] آپ نے اپنے پیرووں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ''بھوکے کو کھلاؤ' قیدی کو چھڑاؤ' اور بیمار کی عیادت کرو'' [۴]

ایک دفعہ آنحضرتؐ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ ''اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی'' وہ کہے گا ''اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار ہے' میں تیری عیادت کیونکر کرتا'' فرمائے گا ''کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا' مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی' اگر کرتا'' تو مجھے اس کے پاس پاتا''۔ [۵] تعلیم کی یہ طرز ادا' بیمار پرسی' بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے' اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرھانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے' اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے' اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں' جو ان بیماروں کی خدمت کرکے اللہ کا قرب پاتے ہیں۔

۱ سنن ابی داؤد' کتاب الجنائز

۲ سیرۃ ابن ہشام' غزوۂ بنی قریظہ و ادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و اصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھئے۔

۳ صحیح مسلم' غزوہ النساء۔

۴ مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۴۔

۵ صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح، اور حکومت و شہنشاہی کے کام کئے، اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری، اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختہ مشق تھا، کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔

اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدہ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہؓ، خبابؓ بن الارت، بلال حبشیؓ، یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابوفکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور سالمؓ غلاموں میں، اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں، اور زید بنؓ حارثہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں، اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز بنالیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو ''گھاٹی'' بتایا گیا ہے، ان میں ایک فك رقبة۔ گردن سے غلامی کی رسی کھولنا بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آ کر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تحریر رقبة۔ یعنی گردن کو آزاد کرنا بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا، اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا، اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی، حضرت حکیمؓ بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے [1] حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے [2] حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ [3] شرک کی

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔
[2] جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرۃ۔
[3] یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔

ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے' ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں' ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے' فرمایا

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ (نساء۔۶)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ' اور پہلو کے رفیق کے ساتھ' اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمھارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے' لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کردی' آنحضرت نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو عبد نہ کہے' بلکہ فتائی میرا جوان کہے' اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ ''وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں' بلکہ مولیٰ کہیں۔'' [1] اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کردیا اور فرمایا کہ ''یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمھارے بھائی ہیں' جن کو اللہ نے تمہارے تحت میں کردیا ہے' پس جس کو اللہ نے تمہارے تحت میں کردیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو' اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو جو اس پر بھاری ہو جائے' اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔'' [2]

حضور کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہوگئی تھی [3] ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں' بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا' کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا' [4] حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہوگئے ہوں ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو' جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو' اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں۔ [5] ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار' اور مملکتوں کا بادشاہ بنادیا' اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے' جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

---

۱ صحیح بخاری کتاب العتق۔

۲ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ما ینہی عن السباب۔

۳ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاداب باب ما ینہی عن السباب۔

۴ حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق' ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔ دوسری حدیث میں او انتمیٰ الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہوکر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت' امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ھو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق)۔

۵ کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گذشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی، اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے، اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے

﴿ هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (ذاریات۔۳)

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انھوں نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں، اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔

اس حکایت سے آداب مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہیں۔

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتداء باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے، کیوں کہ ''روغان'' کے معنی سرعت کے ہیں۔

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ از راہ تکلف اس کو روکیں گے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے، تا کہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے' اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

(۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے' ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہئے' اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے' یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے' کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے' اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا' کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہئے' اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہئے کیوں کہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے' بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوطؑ کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسائش کے ساتھ میزبان' مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے' اس لیے کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے' کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے' اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوطؑ نے کہا۔

﴿ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴾ (حجر۔۵)

کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو' اور اللہ سے ڈرو' اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے' لیکن رسول اللہ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو یہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا' اور فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے' اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے' اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے''۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ''ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے' اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا'[۱] نیز فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔''[۲]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو' اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا بے شک' فرمایا ایسا نہ کرو' نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی' روزہ

---

۱ بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ

۲ بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین۔

بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو' کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے' تمہاری آنکھ کا حق ہے' تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔[1] ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے' پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے' چاہے وہ لے لے' چاہے چھوڑ دے۔"[2]

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے' اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے' اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے' وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے' چنانچہ احادیث میں تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے' کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا'[3] اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی' جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا۔

❀❀❀

۱؎ بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔

۲؎ ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔

۳؎ بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا' ایک ایک خون کا بدلہ کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے' اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا' اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا' اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے' چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے' اور وہ دین کا رشتہ تھا' جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا' دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا' اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی' جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا' اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا' کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾ (آل عمران۔۱۱)

اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو' جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے' اور نہ تم مرو لیکن مسلمان' اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو' اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے' تو اللہ نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا' پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا' اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔

﴿ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (انفال۔۸)

اور اللہ نے مسلمانوں کے دل ملا دیئے' اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا' تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا' لیکن اللہ نے ملا دیا' بیشک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا ہے' اور مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں' اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبوط پکڑیں' اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں' کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں' فرمایا۔

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾ (انفال۔۶)

اور اللہ اور رسول کا کہا مانو' اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے' اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتفاق واتحاد ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے' اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ' اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں باہم الفت ومحبت ہو' اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے' تو اس

کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں اللہ و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں۔

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ (نساء۔۸)

تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں' اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں۔

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ (حجرات۔۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں' تو ان میں صلح کرا دو' پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو' یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو' تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو' اور انصاف کرو' اللہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے' مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں' تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے' یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا' انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ اُنْصُرْ اخاك ظالمًا او مظلومًا ﴾ (بخاری مظالم)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو' خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے' لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو' جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا' اور شریعت اسلامی کو قبول کیا دفعتہً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا' اللہ نے فرمایا۔

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّيْنِ ﴾ (توبہ۔۲)

تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کر لیں' اور نماز کھڑی کریں' اور زکوۃ دیں تو وہ تمھارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے' تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا' اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے' فرمایا۔

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ﴾ (احزاب۔۱)

تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں' اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے' تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبہ رحم کی تحریک فرماتا ہے۔

﴿ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَیْءٌ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے' کیونکہ

﴿ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (حجرات۔۲)

کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے' اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جز بنالیں' اور ملا جلا کر خرچ کریں' تو یہ بھی درست ہے' کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں جن کی خیر خواہی ان کا فرض ہے' فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۷)

اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے' کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں' وہ یوں کہتے ہیں۔

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ﴾ (حشر۔۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے، معاف کر۔

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لیے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے۔

﴿ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (حشر۔۱)

اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے' اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں' اللہ نے مدح فرمائی۔

﴿ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ (فتح۔۸)

وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے' اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

﴿اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (مائدہ)

مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت' محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہؐ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے' "مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے' محبت کرنے' اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو' تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے

ہیں۔"[۱] صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا"سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں' کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے' اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔"[۲] مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے' اور اس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضاء اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں' اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں' یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہئے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ"مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار' کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے"[۳] بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا' کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے' اس تمثیل میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے' اسی طرح جماعت اسلامیہ ایک قلعہ ہے' جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے' یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے' جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی' تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' نہ وہ اس پر ظلم کرے' نہ اس کو بے مدد چھوڑے' اور نہ اس کی تحقیر کرے.........انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے' مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے' اس کا خون' اس کا مال اور اسکی آبرو۔"[۴] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے' ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے' جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا' تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا' اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔"[۵]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا"جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا' تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا' اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا' اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے' جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"[۶]

فرمایا"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں"[۷] یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں

---

۱ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب و صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ کتاب البر والصلۃ والآداب' مصر۔

۲ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹' مصر کتاب البر والصلۃ والآدب۔

۳ صحیح بخاری کتاب الآداب ج ۲ ص ۸۹۰ و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۹' مصر۔

۴ صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۸۲' مصر۔

۵ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۳ ص ۱۹۰۔

۶ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۴۔

۷ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

ہے دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھا مسلمان کون ہے فرمایا ''جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔'' [1] یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا' وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے' کہتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ سے تین باتوں پر بیعت کی' نماز کو قائم رکھنا' زکوۃ دینا' اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔'' [2] کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''مسلمان کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسوق) ہے' اور اس سے لڑنا (قتال) اللہ کا انکار (کفر) ہے'' [3] یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آتشی کا حکم دیا ہے' اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کو نہیں مانتا' اور یہ ایک معنی میں اللہ کا انکار ہی ہے' چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے' جو کافروں کے لیے مخصوص ہے' فرمایا ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے' الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے''۔

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ (نساء-۱۳)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا' تو اس کا بدلہ دوزخ ہے' وہ اس میں پڑا رہے گا' اور اللہ اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا' پھر فرمایا ''دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔'' [4] ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔'' [5] جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے' فرمایا ''سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔'' [6] اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اسکی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے' ارشاد ہوا ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو' اور اس کی آبرو جاتی ہو' تو اللہ بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا' اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔'' [7]

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے' تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے

---

۱. صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶' صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱

۲. صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳

۳. صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ و ج ۲ ص ۸۹۳

۴. صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳

۵. صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۰

۶. سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۸۹

۷. ایضاً۔

زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا' ارشاد ہوا کہ ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے۔'' [۱] ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''آپس میں کینہ نہ رکھو' حسد نہ کرو' اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو' اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ' اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔'' [۲] ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت وآبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے' قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہار اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ﴾ (نساء۔۱۳)

اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے' کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں' ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا۔ اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا' یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی' آپ نے ان کو بلا کر دریافت کیا' انھوں نے عرض کی یارسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا' آپ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا ''تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے''۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا ''کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا۔'' [۳]

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔'' [۴] یہ بھی فرمایا کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے' تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا'' [۴] یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا' اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔ جان' ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے' ارشاد ہوا کہ ''جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا' ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی' فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔'' [۵]

فرمایا ''ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں' سلام کا جواب دینا' اس کے چھینکنے پر اللہ تم پر رحمت کرے کہنا' اس کی دعوت کو قبول کرنا' بیمار ہو تو عیادت کرنا' اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا۔'' [۶] یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں' جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے' ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی مسلمان

۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۶۔

۳۔ پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے' دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲۔

۵۔ ایضاً' ص ۹۰۱' صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۴۳ مصر۔

۶۔ صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۵ مصر۔

اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے۔"[1] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "جو کوئی ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے، جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہوگی۔"[2] یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا اس برادرانہ الفت ومحبت کے فروغ ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لیے آنحضرتؐ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔"[3] الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے، اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے، اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔"[4] دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہیں اصولوں پر دنیا میں بنی ہے، اور آئندہ بھی بنے گی۔

۱ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱۔
۲ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۴ کتاب البر والصلۃ۔
۳ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲۔
۴ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے، اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ۔۱)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اس لیے ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (مائدہ۔۲)

اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت پاک انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔

ابو ہریرہؓ اور انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخواناً﴾ (بخاری۔۲)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں۔

﴿لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا﴾ (بخاری)

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے، فرمایا۔

﴿من لا يرحم لا يرحم﴾ (بخاری)

جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

جو بندوں پر رحم نہیں کرتا' اس پر اللہ رحم نہیں کرتا' یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا' مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا'' [۱] یہ حدیث رحمۃ للعالمین کی تعلیم کی شان رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے' ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا' اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا''۔ (بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے' ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا' کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا' صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول کہ کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے' فرمایا' ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے' یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے' [۲] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ''جہاں بھی ہو اللہ کا خیال رکھو' برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے' اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ''۔ (باب ماجاء فی معاشرۃ الناس صفحہ ۳۳۱) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ﴿واحبّ للناس ماتُحب لنفسك﴾ یعنی تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔ [۳] الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو' انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے' ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو''۔ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے' اور ایک عام انسان بھی' تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو''۔ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے' اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہئے' کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ وخیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے' تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا' قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے' حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی' اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی

۱۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲' تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

۲۔ مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج ۴ ص ۱۵۹۔

۳۔ یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب میں ہیں۔

ضرورت پوری کرنے اور اپنی عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے، اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، اللہ کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے، فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں، اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں، ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔[1]

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں، آنحضرت نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن نے[2] ''اسیر'' کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہ اور عمرو بن میمون اور عمرو بن شرحبیل صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا،[3] اور خود حضور نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔[4] تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بناء پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری۔[5]

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ۔ (بقرہ۔۳۷)

ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی سے خرچ کرو وہ تمھارے ہی لیے ہے۔

یعنی تم کو تمھاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿ لا يؤمن احدكم حتى يحب للناس ما يحب لنفسه وحتى يحب المرء لا يحبه الا الله عزو جل ﴾ (جلد ۳ ص ۲۷۲)

تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف اللہ کے لیے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

---

[1] ترمذی ابواب الزہد غریب۔

[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲، مصر۔

[3] سورہ دہر۔

[4] کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳، ۶۱۴، مصر، بخاری کتاب الجمعہ۔

[5] مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا' اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے' اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی' اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے' وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے' اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھاؤ' اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے' دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا' جو رک جاتا وہ ہار جاتا' یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے' یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی' ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے' ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے' اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے' اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا' عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے' آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے'[1] ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا' اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے' اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے' جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے'[2] اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے' رسول اللہؐ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے'[3] یہ ایک خاص صورت تھی' لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے[4]

بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا'[5] ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو اللہ اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا، صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے' یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے'[6] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا' اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں' سنن نسائی

---

1. طبری۔
2. ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہتہ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵۔
3. بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ والمصبورہ والمجثمۃ۔
4. ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فھو میت۔
5. بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ والمصبورۃ والمجثمۃ۔
6. مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۲۳۳۔

میں ہے کہ ''جو شخص کنجشک کو بلا ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے' اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا'' [1] جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے ان کا مارنا بھی جائز نہیں' چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی' شہد کی مکھی' ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ [2]

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں' ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا' ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے' اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو' تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے' یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں' فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تم پر رحم کرے گا' [3] یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی' [4] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے' کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی' اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا' البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے' [5] مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں' جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں' ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے' اس لیے رسول اللہؐ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے' اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی' [6] بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں' اس لیے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گنہگار ہیں' چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو' اگر اللہ ان کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمھارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے۔ ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے' آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے' جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے' جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا' یہ دیکھ کر آپ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے' ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ یہ میں نے کیا ہے' آپ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ' [7] (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو' یا جل نہ جائیں)

---

[1] مشکوۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۲۵۰۔

[2] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۷۹۔

[3] مشکوۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۶۶۔

[4] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔

[5] مسند ابن حنبل صفحہ ۴۳۶۔

[6] نسائی صفحہ ۶۷۴ بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقۃ۔

[7] بخاری کتاب الانبیا صفحہ ۴۹۵۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا' انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا' پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا' اس پر اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا' [1] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا' تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا' ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے' چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی' رسول اللہ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے' واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے' اس کے بچوں کو چھوڑ دو' صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا' دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے' اسی عدم واقفیت کی بناء پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں' اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ [2]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی' اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا' کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے' اور کیچڑ چاٹ رہا ہے' اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا' اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ نے اس کو بخش دیا' صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے' [3] صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے' یا کھیتی باڑی کرتا ہے' اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔ [4] اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے' یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے' اس سے وہی کام لینا چاہیے' چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا' بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں' صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں' [5] نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ' اللہ نے ان کو تمھارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے' تمھارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے' اپنی ضرورتیں اسی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔

[2] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۹۶ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔

[3] بخاری جلد اول کتاب الخلق صفحہ ۴۶۷۔

[4] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء۔

پر پوری کرو۔[1] اگرچہ رسول اللہ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلاضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ' اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی کے ساتھ چلاؤ'[2] تا کہ قحط کی وجہ سے ان کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے' ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا' فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو' ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو' اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔[3]

ایک بار آپ نے ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے' اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا' آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا' اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا اس جانور کے بارے میں جس کا اللہ نے تم کو مالک بنایا ہے' اللہ سے نہیں ڈرتے' اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔[4]

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی' اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔[5]

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا'[6] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔
[2] بخاری ابواب الحرث والمزارعہ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ۔
[3] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ۔
[4] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔
[5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔
[6] ایضاً۔

فضائل اخلاق

اخلاق حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے‘ قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں‘ ایک امہات اخلاق‘ اور دوسری فروع اخلاق امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں‘ جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں‘ اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں‘ اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں‘ قوت علمیہ‘ قوت شہوانیہ‘ قوت غضبیہ‘ قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت‘ قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے‘ اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں‘ پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیم محض فلسفیانہ ہیں‘ یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں‘ لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے‘ کیونکہ اس کا منشاء انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں‘ بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عملاً بچانا ہے‘ اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے‘ اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں‘ بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے‘ اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہل فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے‘ اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے‘ مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے‘ ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے‘ اور ہر وہ کام برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے‘ گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے‘ اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق اللہ کا نقصان بھی ہوتا ہے‘ اس بناء پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں‘ وہ اخلاق جن کو اللہ پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں‘ اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے‘ رذائل ہیں‘ ہم نے اوپر ”اخلاق اور محبت الٰہی“ کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو اللہ پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے‘ یہ فضائل بہت سے ہیں‘ اور قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے‘ لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے‘ اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو‘ اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو‘ اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے‘ اور غور و فکر کرنے والوں میں اس

بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے' لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے' اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست:

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے' اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے' یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے' قرآن پاک اور احادیث نبوی میں جابجا ان کی تفصیل ہے' جیسے

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے' جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں' جو بیکار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے' جو زکوٰۃ دیتے' اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے' کہ ان پر کوئی الزام نہیں' تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں' اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں' اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں' یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے' اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں' نکمی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی' عصمت اور پاکدامنی' امانت داری' اور ایفائے عہد' ایک دوسری جگہ ہے۔

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ﴾

(بقرہ۔۲۲)

اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا' اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی' اور اپنے قول کو جب انھوں نے اقرار کرلیا پورا کرنے والے' اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں' سخاوت' قول و قرار کو پورا کرنا' اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

﴿ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (اللہ کی) فرماں برداری کرنے والے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو اللہ کی مغفرت اور آسمان وزمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۳: ۱۳۴)

جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (اللہ کے نام) خرچ کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفوودرگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

اور جن کے مال میں مانگنے والے، اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بےشبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے، کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت وعصمت، امانت داری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے۔

﴿ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾ (احزاب۔۵)

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں، اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں، اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں اللہ کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے۔

(۱) ﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا o وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ﴾ (ع-۶)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں' اور جاہل جب ان سے (جہالت کی) باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔[1]

(۲) ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾

(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں' اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

﴿ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾

اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے' اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾

اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری' دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی' اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے' سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ o وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ o وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد۔ ۲۰۔۲۲)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں' اور قول کو توڑتے نہیں' اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں' اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں' اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں' اور جنھوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا' اور نماز کھڑی کی' اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا' اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں' انہی کے لئے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہوسکتا ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے' اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اللہ کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے' وہ اہل قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں' ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں' یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں۔

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (قصص۔۲۸: ۸۳)

اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے' اور آخر انجام پرہیزگاروں کے

[1] یا سلام کہیں۔

لیے ہے۔

یعنی غرور نخوت نہیں کرتے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (شوریٰ۔۴۰)

اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں' اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (مائدہ۔۶)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ وہ اللہ کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۴)

بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گذر چکی ہے' اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صِدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آ جاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔اسی کا نام صدق یا سچائی ہے' جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوسکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے' کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ایک یہ کہ بدکار ہوں' دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں' تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں' چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں' ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں' ارشاد یہ ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو' چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا۔یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا' جب رات زیادہ گذری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹیں گے اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھٹ گئیں' یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے۔[1]

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو' مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے' سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے' جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا' دلیر ہوگا' دل کا صاف ہوگا' ریاکار نہ ہوگا' اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی' خوشامدی نہ ہوگا' سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا' لوگوں کو اس کے قول وفعل پر اعتبار ہوگا' جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق صفات ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے' اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے' قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اللہ آپ فرماتا ہے۔

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ (نساء۔)

اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا ہے۔

---

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ ن میں کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَّمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ (نساء۔۱۸)

وعدہ کیا اللہ نے سچ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

اللہ سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا۔

﴿ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ (انعام۔۱۸)

اور ہم ہیں سچے۔

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ (آل عمران۔۱)

کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو

﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (زمر۔۴۴)

اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیز گار ہیں۔

اس آخری آیت میں "سچائی" سے مراد اللہ کی شریعت یا کتاب ہے۔ مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے اس سے معلوم ہوا کہ پرہیز گاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں' ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں۔

﴿وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾(احزاب۔۳)

اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔

چونکہ رسول' اللہ سے علم پاتے ہیں' اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں۔

﴿ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ (یٰسین۔۴)

اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے' کیوں کہ ان کی ساری باتیں دعوے' دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے' سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے' ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ (مریم۔۴)

اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے۔

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ (مریم۔۳)

اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا اس وصف سے ممتاز ہوئیں فرمایا گیا۔

﴿ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ﴾ (مائدہ۔۱)

اور ان (عیسٰی) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے

﴿ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ (یوسف۔۶)

یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر وشکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو اللہ سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا۔

﴿ وَاذْكُرْ فِى الْكِتَابِ اِسْمَاعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴾ (مریم۔۴)

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔

اللہ کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

﴿ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۲)

صبر کرنے والے اور سچے۔

اللہ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں، ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے فرمایا۔

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ﴾ (الایہ)

بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں.....

﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (احزاب۳۳:۳۵)

اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے۔

﴿ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ (مائدہ۔۱۶)

یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا

فرمائے گا' چنانچہ فرمایا۔

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ (احزاب۔۳)

تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو' سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ ورابطہ رکھو اور انہیں کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے' ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا' اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ فرماتا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ (توبہ۔۱۵)

اے ایمان لانے والو' اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہرحال آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں' مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں جن کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں' بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے' امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی' ارادہ اور نیت میں سچائی' عزم میں سچائی' عزم کو پورا کرنے میں سچائی' عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی' لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آ جاتی ہیں' یعنی زبان کی سچائی' دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی:

یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے' جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے' وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے' اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے' سورہ احزاب میں ایک آیت ہے۔

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ ﴾ (احزاب رکوع۔۳)

تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے' اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے' صفوان بن سلیم تابعی سے

مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہوسکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہوسکتا ہے، جواب دیا ہوسکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے، فرمایا نہیں۔ [۱] کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر (نہیں)" [۲] مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر برائی ہوسکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے اسی لیے ارشاد ہوا کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگر چہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو [۳] ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا "جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو، تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔" [۴] یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتیں تین ہیں، جب کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے۔" [۵] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے "اگر چہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔" [۶]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے، اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔ [۷]

دل کی سچائی:

صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے

۱۔ موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب۔

۲۔ عن ابی امامۃ عند احمد، عن سعد بن ابی وقاص عند البزار، وابی یعلی، والطبرانی فی الکبیر، والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعاً موقوفاً۔

۳۔ مسند احمد عن ابی ہریرہؓ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الایمان، وصحیح مسلم، وابوداؤد، وترمذی، ونسائی۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الایمان وکتاب الادب وصحیح مسلم۔

۶۔ صحیح مسلم۔

۷۔ صحیح بخاری کتاب الادب۔

ہیں، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ کی خدمت میں آ کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (منافقون۔ ۱)

اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے، اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جان بازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارناموں کو سن کر اللہ کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔[۱] یہ کارنامے اگرچہ غلط بیان نہیں کئے گئے تھے، تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا، کہ ان کے ان کارناموں کی حقیقی غرض اللہ کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی:

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو یا یوں کہئے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے، اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بناء پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، اللہ نے فرمایا۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (حجرات۔ ۲)

مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا، اور اللہ کے رستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار

---

[۱] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ۔

کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔

اس صدق عمل کے کئی مرتبے ہیں‘ ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو‘ مثلاً ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے‘ لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے‘ اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے‘ اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو‘ منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدم یقین کی بناء پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ (محمد۔۳)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو‘ پھر جب کوئی سورۃ اترتی ہے‘ اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو‘ تو ان پر تف ہو (رسول کی) فرماں برداری چاہیے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہیے‘ اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے‘ اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے‘ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو‘ لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو‘ اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے‘ اللہ نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا‘ اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جاں بازی کے جوہر دکھاؤں گا‘ چنانچہ اس کے بعد غزوہ احد میں شریک ہوئے اور نیزے‘ تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی‘ ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی‘ اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی۔ [1]

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (احزاب۔۳)

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے (جاں نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت

---

[1] بخاری تفسیر سورہ احزاب۔

کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو ردو بدل نہیں کیا' تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان کو معاف کر دے[۱] بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف' دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے' قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے' ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں' بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے' ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ سے کہا کہ ''میں اللہ پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں'' آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے' تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے ''میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے' اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں' گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں' گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں''۔ ارشاد ہوا کہ ''تم نے جان لیا' اسی پر قائم رہو۔'' [۲]

صحابہ کرامؓ ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے' اور رسول اللہ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا' ایک بار حضرت حنظلہ اسیدیؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے' انہوں نے پوچھا حنظلہؓ کیا بات ہے؟ بولے میں منافق ہو گیا' ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں' اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں' لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں' حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے' اب دونوں بزرگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا' ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے' یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔ [۳]

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے' فرمایا۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ (تکاثر)

ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا

---

۱ یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرما دے۔

۲ اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک۔

۳ ترمذی ابواب الزہد۔

عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ۔۲۲)

نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا' اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے' یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے' ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں' اول ان کے ایمان کا کمال' دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا' اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا' صدیق کہتے ہیں [1] جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے' چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے' اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم راہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (نساء۔ ۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے' یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ (حدید۔۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے' جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا' یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ ''انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے' زبان کی سچائی' دل کی سچائی' اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

---

[1] الصديق الذي يصدق قوله بالعمل (مجمع البحار) صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے، اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے، اور ان سب کا منشاء یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ (بقرہ۔۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں، (تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور) بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دی گئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، اللہ نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہئے جس کو یہ نہیں ملا، یا ضرورت سے کم کم ملا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔ [۱]

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا

---

۱ تفسیر ابن جریر طبری جلد اوّل تفسیر آیت مذکور۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے نہ دوستی ہے نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روز جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے اللہ کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے جو اللہ کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں اللہ کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی سفارش سے کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے اللہ کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا الاہنا دینا ہو خود رسول کو فرمایا ﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾ (مدثر) اور احسان نہ کر (احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے۔ اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری اللہ دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا ارشاد ہے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ۳۶)

جو اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الاہنا دیتے ہیں ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے فرمایا گیا۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا صاف فرمایا:

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ جانتا ہے۔

یعنی اللہ دل کے حال سے خبردار ہے کہ کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا' دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا' فرمایا:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے' اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے' اور جو بھی تم خرچ کرو' وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا' اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا' اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے' اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾ (بقرہ۔۳۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض' تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ (حدید۔۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض' تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے' اور ہے اس کے لیے عزت کی مزدوری۔

آگے چل کر پھر فرمایا۔

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ (حدید۔۲)

بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض' ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (مزمل۔۲)

اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے' اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو' نہ اس پر احسان دھرا جائے' نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو' بنی اسرائیل سے اللہ نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے' ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے' اور

اس کے بعد آخری بات یہ ہے۔

﴿ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (مائدہ۔۳)

اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

﴿ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (مائدہ۔۳)

تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا' اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا' جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے' اور خوش نیتی کے ساتھ کار خیر میں خرچ کرتے تھے' اللہ نے ان کی تعریف فرمائی۔

﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ﴾ (توبہ۔۱۲)

اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں' اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں' اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔

اللہ نے ایسے سخی داناؤں کو خوشخبری دی۔

﴿ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (توبہ۔۱۲)

ہاں! وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے' ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا' بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

متقی سخیوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے' اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے۔

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین' تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا' دور ہو جاتا ہے' فرمایا۔

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۳۶)

ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ایک دانہ کی سی ہے' جس سے سات بالیں اگتی ہیں' ہر بال میں سودانے ہوتے ہیں' اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے' اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا ہے۔

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے' ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے'

اللہ گنجائش اور کشائش والا ہے' اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے' اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے' اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں' ایک اور مثال دی ہے۔

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ ۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

(بقرہ۔ ۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں' ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو' اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دوگنا دیا' اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی' اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت' بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے' تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے' ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو دیا جائے' وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے' اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے' اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ والیل میں بیان کیا گیا ہے' فرمایا۔

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴾ (لیل۔ ۱)

تو جس نے (راہ اللہ میں) دیا' اور پرہیز کیا' اور اچھی بات کو مانا' تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴾ (لیل۔ ۱)

اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے' اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے' بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے' اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہ اللہ میں دینے کی عادت' اطاعت و عبادت' یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے' جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے' یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے' دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے' دوزخ کی آگ حرام ہے' مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو' بلکہ مقصود صرف اللہ ہو' اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا دامن دل پاک ہو جائے' تو اللہ بھی اس کے عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا' اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا' اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے' دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے' اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا' اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف' اور جمع مال' حرص و طمع اور

بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ نِ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ﴾ (ھمزہ۔۱)

پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی، اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے۔

﴿ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (الفجر۔۱)

اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو اللہ نے انفاق (اللہ کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے، اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ بخشائش والا ہے، جاننے والا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا۔

﴿ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (بقرہ۔۳۷)

وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے، اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا اور شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سراسر دھوکا ہے، اور اللہ کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا، اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا۔

﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (تغابن۔۲)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے' اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے' تو اللہ سے ڈرو جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو' اور (راہ اللہ میں) خرچ کرو' اپنے لیے بھلائی کرو' اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں' اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض' تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا' اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا' اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے' اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

ان آیتوں میں انفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے' وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے' قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں' یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے نا قابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں' اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی' اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے' اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے' اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں۔

۱۔ میری چیز ہے' میں دوسروں کو کیوں دوں۔

۲۔ دوسروں کو دوں گا تو میرے مال میں کمی ہو جائے گی' جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے' اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں' وہ صرف اللہ کا ہے' وہی اس کا مالک اسی کی چیز ہے' اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہئے۔

﴿ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (حدید۔۱)

اور تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

بخل کی برائی میں کہا۔

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (آل عمران۔۱۸)

اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے' بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے' قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل کیا تھا' اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے۔

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تا کہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی، اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا تردید کی، فرمایا۔

﴿ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ط وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (منافقون ۶۳)

وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں، کہ اللہ کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو، تا کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں [1] اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہے، ان کے بل بوتے سے ہے، اللہ نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا۔

﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ (شوریٰ۔۲)

اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا۔

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا ﴾ (فجر)

سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی، اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔

غرض روزی کی کشائش اور تنگی دونوں اللہ کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں، دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے۔

﴿ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ط بَلْ هِيَ

---

[1] یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

فِتۡنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ قَدۡ قَالَهَا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝ فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوۡا‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ هٰٓؤُلَاۤءِ سَيُصِيۡبُهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوۡا ۙ وَمَا هُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ۝ اَوَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ‌ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ﴾ (زمر۔۵)

سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم پر ملا ہے[1] (اللہ فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی،[2] تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی، اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں، اور جو ان میں سے گنہگار ہیں، ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے، کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے پھیلاتا ہے، (اور جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔

ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، اللہ نے فرمایا۔

﴿وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا‌ ؕ كُلٌّ فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (ھود۔۱)

اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر) سب (علم الٰہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے، وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا، اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے۔

﴿وَمَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ‌ ؕ﴾ (نمل۔۵)

اور تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی اور اللہ بھی ہے۔

روزی دینا اسی کا کام ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِيۡنُ﴾ (ذاریات۔۳)

بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور، مضبوط۔

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم

---

[1] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱ مصر)

[2] چنانچہ قارون کو جب راہ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا، قال انما اوتیتہ علیٰ علم عندی (قصص۔۴) قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔

باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا۔"[1] یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے، تو اللہ بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا" ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے، فرمایا تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔[2] ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک میں یہ آیت پڑھی الھاکم التکاثر تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا۔ پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا یا کھا لیا تو اس کو فنا کر چکا، اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔[3]

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو، اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو اللہ کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو" پھر فرمایا "ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے، ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔"[4]

فرمایا "رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔"[5]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نظارہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے۔

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (منفقون-۲)

---

[1] صحیح مسلم باب الحث علی الانفاق۔

[2] صحیح بخاری جلد۲ باب ماقدم من مالہ فہو لہ۔

[3] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزہاد فی الدنیا۔ حدیث حسن صحیح۔

[4] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔

[5] صحیح بخاری کتاب العلم۔

اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (منافقون۔۲)

اور اللہ ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے، اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہئے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا ''یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو، اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔''[1]

فرمایا ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر، اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے۔''

[1] صحیح مسلم ا صفحہ ۳۰۱ مصر، باب بیان افضل الصدقہ۔

عفت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

﴿ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے، تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاکدامن ہیں

﴿ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾ (احزاب۔۵)

اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''حفظ فروج'' ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں، اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلاء کے ہیں، اور اسی لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بناء پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلاء کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے، اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو، اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے، وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے، جو حصن سے بنا ہے، جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حَصَانٌ، اِحْصَانٌ، مُحْصِنٌ، اور مُحْصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے، یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیغہ میں۔

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (تحریم-۲)
اورعمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔
﴿ وَالَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (انبیاء-۶)
اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے‘ جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا‘ لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے‘ فرمایا۔

﴿ فَاِذَآ اُحْصِنَّ﴾ (نساء-۴)
تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔

اسی سے اس کا فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے۔

﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ﴾ (نساء-۴)
حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔
﴿ مُحْصِنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾ (نساء-۴)
حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے‘ صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں‘ اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے‘ ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں‘ جیسے

﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ (نساء-۴)
اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)

دوسرے شریف آزاد بی بیوں کے معنی میں جیسے۔

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (نساء-۴)
اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

﴿ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (نساء-۴)
پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جز ہے‘ نبی‘ نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے‘ حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان

باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی، اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِىٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ (تحریم۔۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا۔

﴿ وَالَّتِىٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (انبیاء۔۶)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسفؑ نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ﴾ (یوسف۔۴)

اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

اللہ نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا

﴿ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ (یوسف۔۳)

تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شبہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں، حضرت یحییٰ کی تعریف میں فرمایا گیا۔

﴿ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۴)

اور سردار ہوگا، اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا، اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہل بیت نبوی کی زندگی جس عفت، عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی۔

﴿ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ (نور۔۳)

یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لیے بخشائش ہے، اور عزت والی روزی۔

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ[1] آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے

﴿ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ (نساء۔۳)

مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

﴿ وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ ﴾ (نساء۔۳)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

---

[1] اس کا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

اور زنا کے قریب نہ جاؤ' بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے' یہ نہیں فرمایا کہ ''تم زنا نہ کرنا'' بلکہ یہ کہا کہ ''تم زنا کے قریب نہ جانا''۔ اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی' بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی' اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے' اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے' کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا' تنہائی میں ملنا جلنا' بے وجہ اس کے بدن کو چھونا' یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا' یا دوسری غیر شریفانہ حرکات کرنا' ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا' مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے' مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴾ (نور۔۴)

اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں' اور اپنے ستر کی حفاظت کریں' یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے' اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بیباکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے' اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں' مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں' غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں' اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں' اسی لیے زمین پر ہولے چلیں' یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں' سینہ کا پردہ رکھیں' باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں' باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں' بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ پر چلیں' مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں' مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں' کسی سے کوئی تنہائی میں نہ ملے' اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے' یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى زنا کے قریب بھی نہ ہو' کی شرح ہیں' فرمایا

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (نور۔۴)

اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں' اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں' اور

اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے [۱] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں، اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں، [۲] یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں، یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں، اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو اللہ کے آگے توبہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لیے اس میں پیروی کا نمونہ ہے۔

﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاۚ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى ﴾

(احزاب۔۴)

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ خواہش کرے [۳] اور نیک بات کہو، اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو، اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔ [۴]

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ (احزاب۔۷)

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) داخل نہ ہو۔

گو یا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (نور۔۴)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھر والوں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں، شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ

---

۱ جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

۲ یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی) ۱۲۔

۳ یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔

۴ التبرج اظهار و الذينة للناس الاجانب (لسان العرب)۔

دھڑا کر اندر گھس جائے' چنانچہ کاشانہ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے۔

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ﴾ (احزاب۔۷)

اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے' اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہراتؓ کے سلسلہ سے ہے' مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں' تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے' اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں' ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے' فرمایا

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا o لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾

(احزاب۔۷)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں' اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے' اللہ بخشنے والا مہربان ہے' اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے' اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں' تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے' اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے' اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے' شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے' بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے' اور مسلمان بیبیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں' اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں' اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھروں سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں' جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس' زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں' اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں' جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا'[۱] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے' مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا' مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا' کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے' عورتیں بناؤ

[۱] تفسیر سورۂ طبری تفسیر سورۂ نور صفحہ ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد۔

سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں' سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں' بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے [1] اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں' اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح کی' بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے' چنانچہ اس پر یہ آیت اتری۔

﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (نور۔۴)

اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کروایا کرو' اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے' [2] اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے' کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے' سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا' اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی' وحی الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (نور۔۱)

بدکار مرد بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا' اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا' ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے' کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے' اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا۔

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ﴾ (نور۔۳)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں' اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے' اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے' اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں' بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں' [3] اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو

---

[1] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھئے { رحیب قطاب الحبیب منها رفیقة۔ بحسّ الند امیٰ بضة المتجرد۔

[2] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ۔

[3] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے' یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قائل ہے' اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے' اس سے مراد اس کی برائی ہے' یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا انکحوا الا یامیٰ منکم اور فانکحوا ماطاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے' لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے' ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔ [۱]

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے' ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہئے' چنانچہ سورۂ فرقان میں اللہ نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے' ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں' جو اللہ کے ساتھ کسی اور شریک نہیں کرتے' جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے' اور جو بدکاری نہیں کرتے' فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾

(فرقان۔۶)

اور جو اللہ برحق کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے' اور کسی ایسی جان کا جس کو اللہ نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے' اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے' اس کے بعد جو دو باتیں ہیں' ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں' جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ کی تشریحیں ہیں' ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے' مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں' [۲] حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں' [۳] حکم دیا کہ مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں' [۴] فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے' اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا' چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا' ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے' اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا' اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا' ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو' توبہ کرنے کے بعد جائز ہے دیکھو احکام القرآن جصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملا جیون و تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی' تفسیر آیت مذکورہ۔

۱ ابوداؤد کتاب النکاح۔

۲ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرة الفجاء۔

۳ ابوداؤد کتاب اللباس باب فیماتبدی المراۃ زینتھا۔

۴ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین۔

پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو[1] فرمایا کہ عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے [2] سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی' یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے [3] تا کہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے' یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے' [4] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے' یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے' اگر کسی کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ [5]

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کہ بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ میں ڈالیں' شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی' تا کہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ (نور-۱)

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں (یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے' اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے' اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کریں گی' فرمایا۔

﴿ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ (ممتحنہ-۲)

اور وہ بدکاری نہ کریں گی' اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی' اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے' لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی' حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا' اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو' [6] یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو' اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے' جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی' جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے' بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں' یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے

---

۱ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت۔

۲ ابوداؤد کتاب الرجل باب فی المراة تطیب الخروج۔

۳ ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔

۴ مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوة بالاجنبیته والدخول علیها۔

۵ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت۔

۶ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گذرا ہے۔

خلاف تھیں، اس لیے ان سے باز رکھا گیا' اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے [1] اور مدینہ میں انصاری عورتوں سے بھی اس پر عہد لیا' [2] بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا' اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔ [3]

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے' اگر نہ پیش کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے' اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی' اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے' ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے' اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں' تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بناء پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔ [4]

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے' اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے' اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکباز کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا' بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا' بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ [5]

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ (فرقان۔۶)

اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو اللہ نے حرام کر رکھا ہے' اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی' ان سے یہ فعل ظہور میں آیا' اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

---

۱ صحیح بخاری فتح مکہ۔
۲ تفسیر طبری' سورۂ ممتحنہ۔
۳ صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔
۴ اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے' اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل درآمد اسی پر رہا ہے' بخاری باب اللعان۔
۵ بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا“۔[۱] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور اللہ پر اور اللہ کے احکام پر یقین رکھ کر اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے،[۲] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔[۳]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا، لیکن پاکبازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتہً پانی برسنے لگا، تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوء اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کے واسطہ سے اللہ سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی ”خداوندا! میری ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بہت محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سو دینار کما کر جمع کئے، اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، میں فوراً رک گیا، اللہ تعالیٰ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی

---

۱ بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شرب الخمر۔

۲ بخاری کتاب الجنائز۔

۳ بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش۔

کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹالے' چنانچہ وہ سرک گیا'' [1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے' جن سے اللہ کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

[1] بخاری کتاب الادب اجابۃ دعاء من بروالدیہ۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاق جو ہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے' اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو' اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے' اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے' امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (احزاب۔۹)

ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی' تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا' اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا' بےشبہ وہ ظالم اور ناداں ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک الٰہی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے' اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں' اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

اللہ کا فرشتہ جو اللہ کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا' امانت سے متصف ہوتا تھا' تاکہ بندوں کے لیے جو حکم اللہ کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر اللہ کا اصلی حکم سمجھا جائے' اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا ہے'

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (شعراء۱۱)

اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔

﴿مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ (تکویر۔۱)

اس کا کہا مانا جاتا ہے' وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا۔

﴿اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ﴾ (شعراء۔۱۰)

میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی اللہ سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بےکم وکاست تم کو پہنچاتا ہوں' اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا' کیونکہ آپ اپنے کاروبار میں دیانتدار تھے' اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾ (مومنون۔۱)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی' فتح مکہ کے وقت وہ اس کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ (نساء۔۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی' انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے' وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے' اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے' [1] بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے' اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا' اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے' [2] اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے' [3] اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں' جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے' جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں' جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں' بلکہ ہر مالی' قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے' اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے' تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے' اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے' کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے' کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث بننا بھی امانت ہے' کسی نے آپ سے اپنی کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے' اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے' یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے' ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے وہ بھی ہیں۔

﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (مومنون۔۲۳:۸)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی' یا سفر میں گواہ وشاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی

---

[1] تفسیر کشاف زمخشری۔

[2] ایضاً۔

[3] تفسیر ابن جریر طبری۔

﴿ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ﴾(بقرہ۔۲: ۲۸۳)

تو جو امین بتایا گیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کردے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے۔

﴿ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾(انفال۔۸: ۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی، اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی، اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے۔

﴿ يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ﴾ (قصص۔۳)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو، اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے، اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے، لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے، اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا ''پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا، اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی، اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا، اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی، اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے

اندر کچھ نہیں ہوتا' لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے' لیکن کوئی امانتداری نہیں کرے گا' اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کمیاب ہو جائے گی' کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانتدار شخص ہے' آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقلمند' کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے' حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔'' [1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جو ہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے' اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے' اور بتایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا' جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا' جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں' جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں' اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے' کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو' اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا.......... 'اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی' اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی' اور جو اس میں بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا' بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے' البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔ [2]

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس میں امانت نہیں' اس میں ایمان نہیں۔'' [3]
اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے' ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے۔'' [4] اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں' یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے' الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی ''نشستیں امانت کے ساتھ ہوں۔'' مگر تین موقعوں پر کہیں کسی [5] کے ناحق قتل کی' یا کسی کی آبروریزی کی' یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے' بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں' وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے' [6] راز کے یہی معنی ہیں کہ جس کو

---

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ و کتاب الفتن والرقاق و صحیح مسلم و مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ۔
[2] کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۵ حیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعود۔
[3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل' وبیہقی فی شعب الایمان۔
[4] ادب المفرد بخاری باب المستشار موتمن۔
[5] ابوداؤد باب فی نقل الحدیث۔
[6] ابوداؤد کتاب الادب۔

کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے' بلکہ وہ بھی راز ہے' جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا' آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے'[1] امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔[2]

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے' لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے' یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے' تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے' حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''عورتوں کے باب میں اللہ سے ڈرو' فرمایا'' کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔''[3]

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ ''سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا' اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی' اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ اللہ کے ہاں نہیں''[4] فرمایا ''میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی' جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔''[5] یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کار خیر میں دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

---

[1] ایضاً۔

[2] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

[3] صحیح مسلم' حجۃ الوداع۔

[4] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی عن ابن عباسؓ۔

[5] کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے' عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے' درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے' آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے' اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے' جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں' مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے' لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا' حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''عزت اور جلال والے اللہ کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے'' [۱] ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی میں آئے' آپ کے اردگرد صحابہ کا حلقہ تھا' ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے' دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے' تیسرے صاحب چلے گئے' آپ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا' وہ اللہ کی پناہ میں آیا تو اللہ نے پناہ کی جگہ دی' اور جو پیچھے جا کر بیٹھا' وہ شرمایا اللہ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا' اس نے اللہ سے منہ پھیرا [۲] تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیرا۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا ﴾ (البقرہ۔۳)

اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں' جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ﴾ (احزاب۔۷)

اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

حدیث میں بھی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ﴾ [۳]

اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔

قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف اللہ کی غیرت وحیا کے خلاف ہے' حدیث میں آتا ہے ''اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔'' [۴]

---

۱ بیہقی کتاب الاسماء والصفات

۲ بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام

۳ بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق

۴ صحیح مسلم کتاب التوبہ' عربی میں غیرت کا لفظ حیاء سے خاص ہے مگر اس موقع پر اللہ کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں' جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

موسیٰؑ کو مدین کے سفر میں جن دولڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا' ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے' وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں' تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں' اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰؑ کے بلانے کے لیے بھیجا۔

﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ﴾ (قصص۔۳)

تو ان دولڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے' اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے' اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے' اس لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا' ستر عورت کا خیال' نگاہیں نیچی رکھنا' بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا' برہنگی کو منع کرنا' یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا' اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں' اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی' تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا' آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے' آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے' آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی' ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا' میرا تہبند' حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا' [1] نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں۔

﴿کان النبی ﷺ اشد حیاءً من العذراء فی خدرھا﴾ [2]

رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی' مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے' جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ﴾ (احزاب۔۷)

تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے' تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے' اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا' بلکہ بعض حالتوں میں اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے' اس لیے حیاء کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے' شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے' اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم وحیاء دامن گیر نہ ہو' لیکن دوسروں کی مروت

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ و بنیانہا۔

[2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔

سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیاء دار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔[1]

یہی حیاء جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیاء ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیاء بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیاء کا مادہ ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیاء کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیاء کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے، اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً اللہ نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، اللہ نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے اللہ نہیں شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا، فرمایا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ﴾ (بقرہ۔۳)

اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں شرماتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیاء کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ﴾ (احزاب۔۷)

اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں۔

اپنی ذاتی تکلیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ ﷺ کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لیے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیاء کا موقع نہیں۔

یہی حیاء تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیاء کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیاء کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔

آتی' اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے' تاہم چونکہ کمسن تھے' اس لیے شرم سے چپ رہے' لیکن چونکہ یہ شرم وحیاء کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی' اس لیے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ [1]

انصار یہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں' اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

﴿نعم النساء نسآء الانصار لم یکن یمنعهن الحیاء ان یتفقهن فی الدین﴾ [2]

انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیاء نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ ودعوت' پند ونصیحت' ارشاد وہدایت' تعلیم وتعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیاء انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿الحیاء لایاتی الا بخیر﴾ [3]

حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے' بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے' کیونکہ یہی جذبہ حیاء ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے' اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیاء ہو کر انسان جو چاہے کرسکتا ہے' کوئی روک نہیں سکتا' اس لیے فرمایا کہ

﴿ان مماادرك الناس من کلام النبوة الاولی اذالم تستحی فاصنع ماشئت﴾ [4]

لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم وحیاء نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نووی ؒ نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے' کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کرسکتے ہو۔

قرآن وحدیث میں جہاں جہاں فحش' منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں' اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیاء اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے' اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے' اور اسلام کا خاص خلق

---

1. بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق للتفقه فی الدین۔
2. مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلة من الحیض فرصة من سك فی موضع الدّم۔
3. بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔
4. بخاری کتاب الادب باب اذلم تستحی فاصنع ماشئت۔

حیاء ہے، [۱] یہ بھی فرمایا ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے، [۲] فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔ [۳] مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

۱۔ موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

۳۔ ترمذی کتاب الاستیذن والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کرد یکھئے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ ''رحمان'' یعنی بڑا رحم والا ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام ''رحیم'' آتا ہے یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے اللہ کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے کہ جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم اللہ کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اللہ کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (مومن۔۱)

اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔

اس رحمت الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (حشر۔۳)

وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں۔

﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (مومنون)

اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا، اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔''[1]

بنی نوع انسان میں محاسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے، اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے۔

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (توبہ۔۱۶)

(لوگو!) تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمھاری تکلیف ان پر شاق گذرتی ہے (اور) ان کو تمھاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب الادب۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں، اوران امتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے۔

﴿ وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ﴾ (حدید۔۴)

اور جولوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔

اوراس وصف میں امت محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے۔

﴿ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ﴾ (فتح۔۴)

اور جولوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زورآور ہیں، آپس میں رحمدل ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں، اور رحم اور رحمان جو اللہ کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) اللہ کی رحمت کا پرتو ہے، اوراسی سے صلہ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

﴿ الرَّحم شِجْنَة من الرَّحْمٰن ﴾

رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔[1]

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ اللہ ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔''[2]

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ''تم اس پر رحم کرتے ہو''؟ اس نے کہا ''ہاں''، ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔[3]

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے، ارشاد ہو کہ ''اللہ نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔''[4]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله ۔

[2] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی۔

[3] ادب المفرد باب رحمة العیال۔

[4] بخاری کتاب الادب باب رحمة الولد و تقبیله و معانقه۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے' اس لیے فرمایا کہ "جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" [1] اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیردستوں پر کھایا جاتا ہے' تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں' بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی' محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے' اسی لیے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ یعنی وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں۔

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو دردِ دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے' [2] جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں' اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں' اس لیے جس طرح ایک عضو کے دکھ درد میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے' اسی طرح ایک مسلمان کے دکھ درد میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے' اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا' یہ بھی فرمایا کہ "رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا اللہ رحم کرے گا' زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" [3]

رحمدلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں' چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا' [4] ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے' یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں' آپ نے دو بار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ بھی تم پر رحم کرے گا۔

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے' وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا' اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا' اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے' جو بلاغت کی جان ہیں' فرمایا۔

﴿مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ﴾

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی' رحمدلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ انہیں دو لفظوں سے

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجا فی رحمۃ الصبیان۔

[2] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبھائم۔

[3] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس۔

[4] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض۔

ابھارا جا سکتا ہے اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں فرمائے گا' اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے' محدث ابن ابطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے' اس لیے اس میں مسلمان' کافر' مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں' اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا' ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں''[1] غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری' بےکسوں کی تسکین' بیماروں کی تسلی' غریبوں کی امداد' مظلوموں کی حمایت اور زیردستوں کی اعانت کرتے ہیں' اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے' اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبھائم۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو[1] برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں،[2] اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ''اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے۔''[3] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے فرمایا

﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ﴾ (مومن۔۲)

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ ﴾ (احزاب۔۱)

اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں۔

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ (انعام۔۱۴)

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ ﴾ (آل عمران۔۲)

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی اللہ انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف صرف نظم وسلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے، اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل وانصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا۔

۱۔ بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس۔

۲۔ ادب المفرد باب ارحم من فی الارض۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ (نحل۔۱۳)

بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

عدل قانون کا اقتضا ہے' اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے' اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے' اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے' جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے' اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے' پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے' بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں' اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ (نساء۔۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمھارے قبضے میں ہو۔

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے' اس لیے فرمایا۔

﴿ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ﴾ (نساء۔۱۹)

اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے' اس لیے فرمایا۔

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (انعام۔۱۹)

اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے' کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے' اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے' اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے' اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے' اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے' تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

﴿ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ﴾ (بقرہ۔۳۹)

اور (تمھارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

﴿ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ﴾ (بقرہ۔۳۹)

پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا' اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے' ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو' لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی

﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى﴾ (انعام۔۶)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (مائدہ۔۲)

مسلمانو! اللہ واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمھاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے' اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے' اور یہ کہ ہر حال میں عدل وانصاف کرنا تقوی کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے' اس پر بھی رسول اسلام کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلواتی ہے۔

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (شوریٰ۔۲)

اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری' اور مجھے (اللہ سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمھارے بیچ میں انصاف کروں' اللہ رب ہے ہمارا اور تمھارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمھارے کاموں کا' ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں' اللہ ہی سب کو جمع کرے گا' اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں' ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچتی ہے' اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں' دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمھارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے' بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے' اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے' میرے اللہ نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے' اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص اور امیر وغریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے' کیونکہ ہمارا تمھارا سب کا رب ایک ہی ہے' ہم سب اس کے غلام ہیں' اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے' ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا' اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں' سب کو

قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل و انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشاد الٰہی ہوا۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ (نساء۔۲۰)

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو اللہ کے لیے گواہ بنو اگر چہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات میں عدل و انصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو، عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرف داری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو یا کہو، پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپا لو تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا، اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرفداری کرنی چاہئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہئے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے

بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی، اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

﴿ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔[۱]

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے، اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا۔

﴿ وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (الحجرات۔۱)

اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرتے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

عدل وانصاف حکومت وسلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا:

---

[۱] تفسیر روح المعانی۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ﴾ (نساء۔۸)

بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ' اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو' تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ''امانت'' سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہئے' اللہ نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے' اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے' اور یہ فیصلہ دوست ودشمن' کافر ومسلم سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہئے' چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا۔

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (مائدہ۔۶)

اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل وانصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل وانصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے' یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے' قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے' تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو' اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو' قوت نطق سے محروم نہ ہو' صاحب علم ہو' چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (النحل۔۱۰)

اور اللہ (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کرسکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا' کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہوسکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا' اور قادر ہونا چاہئے کیونکہ حکم سے علوئے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے' اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوئے مرتبت حاصل نہیں ہوسکتا' اور عالم ہونا چاہئے تاکہ ظلم وانصاف میں تمیز کرسکے' اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے' پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہئے' پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہئے' پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا' اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہئے تاکہ وہ ہر کام کو سلیقہ سے کرسکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق' معاشرت اور

سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے تاہم امام و حاکم وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے اس لیے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا' سات شخصوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے گا' جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا''۔ [1]

❀❀❀

[1] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ (آل عمران، رعد۴)

بے شبہ اللہ کے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴾ (زمر۔۳)

اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ (روم۔۱)

اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ (حج۔۲)

اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔

﴿ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ﴾ (بقرہ۔۹)

تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا۔

﴿ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (توبہ۔۱۴۰)

اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے، اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے۔

﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ﴾ (بقرہ۔۲۲)

اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے' اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

کسی کی امانت کو رکھ کر بلاکم وکاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے' اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا' یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا' اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا' اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا' اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا۔

﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

اور عہد کو پورا کیا کرو' (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی' اور جب ناپ کر دو' تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (تول کر دینا ہوتو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

قانون یا رسم ورواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے' وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے' اس لیے تاکیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہیں' بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے' یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روز الست کو بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا' اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے' اور دوسرا وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے' تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے' اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے' اور جن کے ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے' ارشاد ہے

﴿ اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (رعد۔۳)

جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے' اور جو اللہ نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے' ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہے' پھر اس قول وقرار کو جو

باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے' ان کے بعد اس فطری عہد کا ہے' جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے جو اللہ کو حاضر و ناظر بتا کر یا اللہ کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں' فرمایا۔

﴿ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ﴾ (نحل۔۱۳)

اور اللہ کا نام لے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو' اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو' اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے' اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے' ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آ جاتے ہیں جو اللہ کا واسطہ دے کر اور اللہ قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفاء کی نصیحت کی گئی ہے' فرمایا۔

﴿ وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ اَوۡفُوۡا ذٰلِكُمۡ وَصّٰكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ﴾ (انعام۔۱۹)

اور اللہ کا قرار پورا کرو' یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے تاکہ تم دھیان رکھو۔

اس عہد الٰہی میں اللہ کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں جن کے بجالانے کا اقرار تم نے اللہ سے کیا ہے' یا اللہ نے تم سے لیا ہے' اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے جس کو اللہ کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے' اور انسانوں کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا' اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی' اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا' مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی' کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو' جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا' پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو۔

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى الَّذِيۡنَ عَاهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَؕ ۝ فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ ﴾ (توبہ۔۱)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' تو پھر لو (تم اے مشرکو!) ملک میں چار مہینے' اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی' تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم

رکھا تھا' فرمایا۔

﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (توبہ۔۱)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا' پھر انھوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی' اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی' تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو' بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔

اوران مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے' اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا' اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے۔

﴿ كَیْفَ یَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِیْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (توبہ۔۲)

مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو' مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا' جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو' بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔

''سیدھے رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو' اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں' ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے' جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں' نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفاء اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے' اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (مائدہ۔۱)

مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں' اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے' اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے' چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اوفو بالعهد'' اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے ''یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقد بیع' عقد شرکت' عقد یمین' عقد نذر' عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں' خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پاجائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔''[1]

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے' اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے' یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۰۵

جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔''[1] یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے ''حسن العهد من الایمان'' اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں، تمھارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمھارا کیا حال رہا، اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا ''عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے''۔ یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے، اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔

﴿لا دين لمن لا عهد له﴾ (احمد، طبرانی و ابن حبان)

جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں۔

یعنی اس قول و قرار کو جو بندہ اللہ سے کرتا ہے یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعے کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا، وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

[1] بخاری کتاب الادب باب حسن العهد من الایمان۔

احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے' اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا' البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حدود پایاں نہیں' عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے۔

﴿ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَاتُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ ﴾ (ابراہیم۔۵)

اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا نہ گن سکو گے' بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

حضرت یوسفؑ اللہ تعالیٰ کے اس احسان [1] کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قید خانہ سے نجات دی' اور وہ ان کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا' ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

﴿ وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَجَآءَ بِكُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ ﴾ (یوسف۔۱۱)

اور اللہ نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانے سے باہر لایا' اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے' فرمایا۔

﴿ اَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَیۡكَ ﴾ (قصص۔۸)

تو احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا۔

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادلاً بدلاً داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامن گیر ہے' احسان' حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے' محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے' اور قرآن مجید میں جا بجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے' چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیٴِ ذِی الۡقُرۡبٰی ﴾ (نحل۔۱۳)

اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا' وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے'

---

[1] اس موقع پر ایک اور بات خیال میں رہے عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں' اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الی باب کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآن پاک میں جہاں جہاں محسن یا محسنین یا محسنون کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے' اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیے جائیں گے۔ اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے' لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (توبہ: ۱۵) بے شبہ اللہ اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا۔ لَوۡ اَنَّ لِیۡ كَرَّةً فَاَكُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (زمر: ۶) کاش اگر میرے لیے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (آل عمران: ۱۴) اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا' پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا' لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں' بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں' اور عام لوگوں کے علاوہ باپ' ماں' قربت دار' یتیم' محتاج' قرابت دار پڑوسی' اجنبی پڑوسی' آس پاس کے بیٹھنے والے' مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت میں (رکوع ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے' اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ۹، زخرف ۷، انعام ۱۶، اسرائیل ۳)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے' لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے' اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے' یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا۔

﴿ وَاَحۡسِنۡ كَمَآ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ﴾ (قصص۔۸)

اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے' تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے' اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی' اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔

﴿ وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ ﴾ (یوسف۔۱۱)

اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، احسان کی اہم صورتیں ہیں' اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں' جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا' جس سے روکا گیا' اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو' فرمایا

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ﴾ (بقرہ۔۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو' اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو' فرمایا۔

﴿ فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کر دیا جائے' تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث

مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی اللہ کے محبوب بندوں میں ہوں گے۔

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف [۱] مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے، اور شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسن خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے۔

﴿ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (بقرہ۔۳۱)

اور آپس [۲] میں فضل مت بھولو بے شک اللہ تمھارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں [۳] فرمایا۔

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ﴾ (نور۔۳)

اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں وہ قرابت داروں، غریبوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہئے کہ معاف کریں اور درگذر کریں۔

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے، قرآن کریم کا حکم ہے۔

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (اعراف۔۲۴)

اور نیکی کرنے کو کہہ۔

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

﴿ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ ﴾

ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب و امیر کی تخصیص نہیں بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لیے آپ

---

۱ یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

۲ سعید سے روایت ہے ''آپس میں فضل کو مت بھولو''۔ یعنی ''احسان کو مت بھولو''، ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر۔

۳ کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

نے فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے“ فرمایا ”کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے“ فرمایا ”غریب حاجت مند کی اعانت کرے“۔ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے؟ فرمایا ”نیکی کے کرنے کا حکم دے“ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے، ارشاد ہوا کہ ”برائی سے باز رہے“ کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے“ اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ ”آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے“ کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔“ [1]

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ”بر“ کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے۔

﴿ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (ممتحنہ۔۲)

جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو اللہ تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نا مسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمھارا نہیں میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا، [2] ارشاد ہوا۔

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۷)

تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے، اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر، اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی، اور تمھارا حق مارا نہ جائے گا۔

گو یہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے، جو نیک کام کریں گے ان کو اللہ کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا۔

﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ (رحمان۔۳)

بھلائی کا بدلہ کیا ہے مگر بھلائی۔

گو یہ آیت پاک اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقة مع فتح الباری۔

[2] ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے' دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے' قرضداروں پر احسان کرنا' ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگدست مقروضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں' ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سودخواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے' وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے' اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا' آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے' بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے' قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے۔

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (بقرہ۔۳۸)

اور اگر (کوئی) تنگدست (تمھارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمھارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ ''قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا' جن میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔''[۱] اس کو اور بھی موکد کر دیا' اور قرض کے معاملے میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں' یعنی مہلت دینا قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ ساتھ تقاضا کرنا' اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے' چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا' لوگوں کو قرض دیتا تھا' اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو' شاید اللہ ہم سے بھی درگذر کرے' چنانچہ اللہ نے اس کے صلہ میں اس سے درگذر کیا' دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا' جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں' فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو' اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا' اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا' اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا' اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔[۲]

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں' ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے[۳] یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا' یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔[۴]

۱؎ بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری۔
۲؎ مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر۔
۳؎ مسلم کتاب البیوع باب فضل۔
۴؎ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۸۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے' زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے' چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے' تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو' کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو' چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو' اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔" [1]

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے' محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے' ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آ کر پوچھا کہ "یا رسول اللہ ﷺ میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا' تو کیا جب اس کا گذر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں" فرمایا "نہیں' تم اس کی مہمانی کرو۔" [2]

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا "ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو' صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو' کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے' اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے' بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے' اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔" [3]

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں' اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو' ارشاد ہوا "تمہاری تقریر گو مختصر ہے' لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے' تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ"۔ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا "نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے' اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے' اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو' اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ' اور پیاسے کو پلاؤ' اور نیکی کے کام کرنے کو کہو' اور برائی کے کام سے باز رکھو' اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔" [4]

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے' فرمایا "جو روزی اللہ نے دی اس میں سے دوسروں کو دے" عرض کی "اے اللہ کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی "اگر اس کی زبان معذور ہو" فرمایا "مغلوب کی مدد کرے" عرض کی اگر وہ "ضعیف ہو' مدد کی قوت نہ ہو" فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے" عرض کی "اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو" فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔"

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح۔

[2] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو۔

[3] جامع ترمذی ایضاً انظار المعسر۔

[4] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب۔

عفوودرگذر

عفوودرگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے' اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے' اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے' اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ' غَفُوْرٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ ﴾ (شوریٰ۔۳)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے' اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کردے یا ان کو معاف کردے' فرمایا۔

﴿ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (شوریٰ۔۴)

(اگر اللہ چاہے تو) گنہگاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کردے اور بہتوں کو معاف کردے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے۔

﴿ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ (طٰہٰ۔۴)

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر راہ پر رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پانچ دفعہ غفار (بڑی بخشائش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عفو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفور (بخشنے والا) کہا ہے' جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفوودرگذر کا سمندر کس زوروشور سے جوش مار رہا ہے' اللہ نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے۔

﴿ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (نساء۔۲۱)

یا کسی برائی کو معاف کرو' تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا۔

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں' وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے' تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے' اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔ [1]

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا' ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے' فرمایا

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (نور۔۳)

اور چاہئے کہ وہ معاف کردیں اور درگذر کریں' کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے' اور اللہ معاف کرنے والا

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان۔

مہر والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تمہیں معاف کرے گا' اور جب اللہ غفور ورحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہئیں' چنانچہ جن مومنوں کے لیے اللہ نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے' ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے۔

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (شوریٰ۔۴)

اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں' جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا' لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں' اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ وغضب کی حالت ہوئی' لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے' کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے' ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں' اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں' ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَايَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَايُبْصِرُوْنَ ۝ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ (الاعراف۔۲۴)

اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں' حالانکہ وہ دیکھتے نہیں (اے پیغمبر) درگذر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں' یا تو تبلیغ ودعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے' اللہ نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو' صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو۔

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴾ (مومنون۔۶)

(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو' جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں' لیکن اللہ نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو ودرگذر کا حکم دیا ہے۔

﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ (بقرہ۔۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب باوجود یہ کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں' تو معاف کرو اور درگذر کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہئے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزاء وسزا کے قائل ہو' اس لیے سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا' فرمایا:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (جاثیہ۔۲)

ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزاء وسزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں' تا کہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے' جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لیے کیا' اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا' پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگذر کی نصیحت فرمائی' [1] (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے' لیکن اس حالت میں بھی

---

[1] اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے' عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے' جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے' امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں' 'اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ) میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں' مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں' جلد ۴ صفحہ ۴۹۶

ایک اور آیت (ادفع بالتی هی احسن) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے' اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو' ' ج ۶ صفحہ ۳۰۰

آیت و اذا خاطبهم الجاهلون قالو اسلاماً کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

' 'کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا' لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں' کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے' اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ ج ۶ صفحہ ۴۹۷ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر۔

آیت یغفرو اللذین امنوا (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

' 'اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے' چنانچہ حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے' اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے' لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہؓ کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (نور-۳)

اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں' بلکہ (چاہئے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگذر کریں' (مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑ سے ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں' اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

﴿ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (آل عمران-۱۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان (کا پھیلاؤ' بچی سجائی) ان پرہیز گاروں کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ اللہ میں دینا' اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا' اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حصہ)

جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا' لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے (جلد ۷ صفحہ ۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد ہیں' یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں' اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں' درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے (ج ۶ صفحہ ۳۹ مصر)

درگذر کرنا اوران کے لیے دو جزائیں‘ ایک اللہ کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت‘ بیان کی گئی ہیں‘ اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے جس کی حدو پایاں آسمان وزمین ہے‘ اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ اللہ کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی‘ اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو درگذر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مترادف ہو جائے‘ اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے‘ اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو‘ جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے‘ کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ۔۴)

اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں‘ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے‘ بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے‘ جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے‘ جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں یا وہ ہوں جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں‘ اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے‘ کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے‘ اسی لیے فرمایا۔

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (شوریٰ۔۴)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے‘ اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے۔

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ○ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (حم سجدہ۔۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے ناتے والا‘ اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جن میں صبر ہے‘ اور یہ بات ملتی ہے

اس کو جس کی بڑی قسمت ہے' اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ' بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے' اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے' حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا۔

''اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا' اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا' اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے' جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا' [1]

ابو مسعود صحابیؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی' جان لو جان لو' مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے' فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ اللہ کو تم پر ہے' ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں' آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے' اس نے پھر یہی پوچھا' تب آپ نے فرمایا ''ہر روز ستر دفعہ'' [2] اس سے مقصود نبوی تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آ جائے گا' لیکن یہ خیال صحیح نہیں' انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے' مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا' یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے' اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے' اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ [3]

﴿وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا﴾

اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے' نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔

---

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

[2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

[3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع۔

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے، اور قصور وار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، انتقام نہیں لیتا، اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۲۸ مائدہ۔۱۴)

اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (آل عمران۔۱۶)

بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ (اسرائیل۔۵ ملائکہ۔۵)

بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (نساء۔۲)

اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (حج۔۸)

بے شک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴾ (احزاب۔۶)

اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے، یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۳۶)

اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم، اگر اس برائی

کرنے والے کورام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا' اس لیے اس نے اپنے حلم اور دارو گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے' تا کہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی' اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو' فرمایا۔

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۳۰)

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے' تو اس سے ڈرتے رہو' اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے' یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے' دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں' اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے' ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی' اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو' دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے' اس لیے اس سے پرامید بھی رہنا چاہئے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے' اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے' اس موقع پر اس کا ارشاد ہے۔

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (تغابن۔۲)

اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دوگنا کردے گا اور تمہیں معاف کرے گا' اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے' کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں' اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس میں ایک عیب ہے' مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں' تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے۔

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے' خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے انہوں

نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی برد باری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی، اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ (توبہ۔۱۴)

اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) برد بار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود اللہ سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴾ (ھود۔۷)

بے شک ابراہیم برد بار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے:

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ (والصّٰفّٰت)

تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے برد بار لڑکے (اسماعیلؑ کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (والصفت۔۳)

اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجئے انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزء ہے۔ حلم کی صفت اللہ کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا۔[۱] یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو" اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

۱؎ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی التانی والعجلۃ۔

''پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے' بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے''۔[۱] ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔''[۲]

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں' میں ان کے ساتھ ملتا ہوں'[۳] وہ کاٹتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں' وہ بدی کرتے ہیں' وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں' میں تحمل کو راہ دیتا ہوں' آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ''اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو' تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو' اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی''۔[۴]

---

۱ بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔

۲ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب۔

۳ یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔

۴ صحیح مسلم باب الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے، اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ''لطیف'' فرمایا ہے[1] اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے[2] جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق و لطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا، اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴾ (یوسف۔۱۰)

بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں، اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، ان کی حکمت کو اللہ ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق ولطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

﴿ اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ہُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ﴾ (شوریٰ۔۲)

اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، بیچ میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطف الٰہی کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق

---

[1] راغب اصفہانی ''لطیف'' کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے (لفظ لطف) امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں: ''اللہ کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے۔ لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔ صفحہ ۴۷ الہ آباد۔

امام غزالی کہتے ہیں: اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے، جس کے حق میں وہ مفید ہیں۔ جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے (روح المعانی، تفسیر شوریٰ)

[2] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الرفق۔

پہنچاتا ہے۔[1] اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب نہ ہوئی،[2] مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا۔

﴿ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ ﴾ (توبہ۔۱۴)

بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔

اسی طرح جب وہ قوم لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

﴿ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴾ (ھود۔۷)

بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعاء کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے اس لیے جلد پسیج جاتے تھے، اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ اور ہارونؑ فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں۔

﴿ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى ﴾ (طہٰ۔۲)

سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا (اللہ سے) ڈرے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے دین حنیف کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمت الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا۔ خود حضور ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ‌ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ‌ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں، اور اسی لیے رحمت عالم ﷺ کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں

---

[1] تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں۔

[2] حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پر کر اس کے بعد اس سے اپنی علیحدگی ظاہر کر دی۔

طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق وتلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا۔

﴿ انّ لرّفق لایکون فی شییءٍ الّازانه ولاینزع من شئی الا شانه ﴾ [1]

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

''جس چیز'' کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی، اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔'' [2] جریر بن عبداللہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو نرمی سے محروم رہا، وہ بھلائی سے محروم رہا۔'' [3] اور فرمایا کہ ''تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی اللہ اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔'' [4]

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی۔

﴿ الا اخبر کم بمن یحرم علی النّار و تحرم علیه النّار علی کل قریب هین سهل ﴾ [5]

کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ''السام علیکم''، یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں، اور انہوں نے جواب میں کہا ''وعلیکم السام واللعنۃ''، یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''عائشہ ٹھہر جاؤ، اللہ تمام کاموں میں نرمی پسند کرتا ہے''۔ بولیں یا رسول اللہ انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا، فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ وعلیکم یعنی ''تم پر'' [6]

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس میں سختی کا نشان نہیں، اور پھر اس طرح

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

[2] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

[3] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

[4] ترمذی ابواب الزہد۔

[5] ایضاً۔

[6] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ۔

سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا۔

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ (تحریم۔۲)

اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ﴾ (توبہ۔۱۶)

اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہئے کہ وہ تم میں کڑا پن پائیں۔

اسی طرح شریعت کے گنہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے اجراء میں نرمی نہ برتیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (نور۔۱)

اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔"[1] امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِؓ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔[2] حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن اللہ کے حق میں آپ اس قدر سختی سے کام لیتے تھے جس کا اللہ نے حکم دیا تھا" (فتح الباری جلد ۱۰۔ ۴۲۹ مصر)

آنحضرت ﷺ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو، سختی نہ کرو۔"[3] شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے، اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے

۱۔ بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا۔
۲۔ باب ما یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ۔
۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا۔

حضور کی خدمت میں لے چلو۔ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمت نبوی میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ارشاد ہوا" کہ ایک غلام کی گردن آزاد کرو" وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ" یارسول اللہ ﷺ اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں"۔فرمایا" لگا تار دو مہینے روزے رکھو"۔گذارش کی کہ "یارسول اللہ ﷺ روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی' پھر روزہ رکھوں' فرمایا" ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ" عرض پرداز ہوئے کہ" قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گذاری ہے"۔فرمایا کہ" صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو' اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ"۔وہ صحابیؓ ہنسی خوشی اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ" میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے' اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی"۔ [1]

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی الظہار۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (جاثیہ۔۴)

اور اسی کو بڑائی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع و خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنوں کے ساتھ محبت تواضع کا حکم دیا ہے۔

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾ (حجر۔۶)

اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

﴿ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر ومحبت سے جھکا دے۔

''خفض جناح'' یعنی بازو جھکا دینا تواضع وخاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوں کو جھکا دیتا ہے۔ اس سے یہ استعارہ[1] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے۔

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ﴾ (الفرقان۔۶)

اور رحمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے اللہ کے بندے کہہ کر نصیحت

---

[1] المثل السائر باب نوع و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۴۷ دار الطباعۃ العامرہ۔

فرمائی گئی کہ اللہ جب رحمت اور مہر وکرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلق اللہ کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی۔

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ (لقمان۔۲)

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر' اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا' اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں' بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے' چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو' اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنائت و پستی میں بڑا فرق ہے۔ تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہو' اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے' اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھودے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو' وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور ان کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے' اس پر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں' تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔[۱]

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے' اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے' چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو اللہ ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے' جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا اللہ کو پسند ہے' اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند۔[۲]

بہرحال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف' ذلت' بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے' ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے' لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے۔''[۳] ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے' لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو اللہ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلّہ پسند کرے اس کو پہن لے۔''[۴]

---

[۱] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف وصحیح بخاری عمرۃ النبی ﷺ۔

[۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

[۳] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع۔

[۴] ترمذی ابواب الزہد۔

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔''[1] اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

❁❁❁

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلو ملحوظ رکھے' تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مرّوت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا' شکریہ ادا کرنا' حال پوچھنا' ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا' اچھی باتیں کرنا' اچھی باتیں سمجھانا' اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا' اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ۔۱)

اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا' نصیحت کرنا' اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے' ارشاد ہے۔

﴿ وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا﴾ (بنی اسرائیل۔۶)

اور اے (پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو' بے شک شیطان جھڑپواتا ہے آپس میں' بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے' جو شیطان کا کام ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ' نفرت' حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ نیک بات بولیں' نیک بات کہیں' اچھے لہجہ میں کہیں' اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر ومحبت پیدا ہو۔ اسی لیے تنابزو بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر وکراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں' پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے' فرمایا۔

﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ﴾ (حجرات۔۲)

اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو' ایمان کے بعد گنہگاری برا نام ہے۔

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے' ارشاد ہے۔

﴿ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (نساء۔۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا' مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے' نہ لعنت بھیجتا ہے' نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے۔'' [۱]

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق وصداقت' بہبودی و خیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے۔'' [۲] اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمہ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے' کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا ''دوزخ سے بچو' اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو' اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔'' [۳]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا' اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا' ایک بدوی صحابیؓ مجلس میں حاضر تھے' بیتابانہ بولے کہ یارسول اللہ ﷺ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی' بھوکوں کو کھلایا' اکثر روزے رکھے' اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔ [۴]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اچھی بات صدقہ ہے۔'' [۵] یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے' اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ ﷺ نجات کیونکر ملے''۔ فرمایا ''اپنی زبان پر قابو رکھو' اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو' اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔'' [۶] ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے' آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا ''اس کا ڈر ہے۔'' [۷]

۱۔ صحیح بخاری باب طیب الکلام۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۳۔ ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ۔

۴۔ ترمذی ماجاء فی قول المعروف۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الصلح۔

۶۔ ترمذی باب حفظ اللسان۔

۷۔ ترمذی ایضاً۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرے کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا [1] اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح و ستائش کی۔ [2]

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (حشر۔۱)

اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی، اور محبت رکھتے ہیں اس پر جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا، اور ان (مہاجروں) کو دیئے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے، اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی، جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں۔ فرمایا اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔ [3]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی، آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ ﷺ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تم نے کیوں مانگ لی؟ بولے ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ [4]

---

[1] صحیح بخاری اول مناقب انصار۔

[2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری۔

[3] صحیح بخاری اول باب مناقب انصار۔

[4] صحیح بخاری باب حسن الخلق و باب من استعد الکفن۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانہ نبوی میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص آج رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی۔ اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا۔ بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔" [1]

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے [2] لیکن قرآن پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

[1] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر۔

[2] ایضاً۔

اِعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسلکوں کے افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو اُمَّةً وَّسَطًا بیچ کی امت کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں یہ بھی کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے[1] اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے۔

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَا تِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۱۲)

اور تو نہ پکار اپنی دعا (نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے، اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے:

﴿ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ﴾ (لقمان۔۱)

اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے، اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریا کار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے۔[2]

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں، سارے مذہبوں نے اس پر تاکید کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا۔

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے، اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ (فرقان۔۶)

اور جو خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کریں، اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔

---

[1] تفسیر کبیر رازی آیت مذکور (بقرہ)۔

[2] ابن جریری طبری (روح المعانی)۔

یعنی نہ اسراف ہو نہ بخل ہو' درمیان کی چال ہو۔
صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ اکلفوا من الاعمال ماتطیقون ﴾

اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو۔

"عمل" کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز وغیرہ عبادتیں ہیں۔[1] مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو' دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔
مسند بزار میں حضرت حذیفہؓ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:[2]

﴿ ما احسن القصد فی الغنی مااحسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادة ﴾

دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے' محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے' عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے' نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان وشکوہ عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں' اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر غبی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں' اور یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہئے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہئے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ص ۲۵۶۔
[2] بروایت کنزالعمال جلد ثانی۔

خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَزِیْزٌ لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت[1] والا اور غالب، کہیں کہیں عَزِیْزٌ کے ساتھ قَوِیٌّ (قوت والا) یا مُقْتَدِرٌ (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو۔ اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلبگار رہتے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا۔

﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ (نساء۔۲۰)

کیا ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ (فاطر۔۲)

جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

﴿ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ﴾ (آل عمران۔۳)

اے خدا تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (منافقون۔۱)

اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر

[1] عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے یہ ہے: کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ، نساء، ص، منافقون۔

باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہئے' اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہئے۔ تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہؓ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا' اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا' حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں' ارشاد ہوا بیشک ایسا ہی ہے۔ عرض کی تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں [1] ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں' اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسول خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی' اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوہ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جایا کرے گا' لیکن جب انصارؓ کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور اللہ سے بے خبر تھے' تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور کی بدولت ہم عزت پا چکے ہیں، ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں [2]

صحابہؓ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا۔ مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا' اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے۔

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (آل عمران۔۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علیؓ سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے' فرمایا غرور نہیں خودداری (عزت) ہے۔ یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (منافقون) ایک مسلمان صالح بی بی کے کپڑے پرانے تھے' تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں' یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں' اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے' اور غرور اپنی ذات کی اصلی

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد۔

[2] سیرۃ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب بسند۔

حیثیت کوفراموش کر جانے اوراس کواس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔ [1]

یہ خودداری عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہوتو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگذر کرنا پڑتا ہے۔قرآن میں مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے۔

﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ (فرقان-۲)

اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گذر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کوانہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاق خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک بات پرنظر رکھنی پڑتی ہے چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہولیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور ونمائش کی بوتک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو۔یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔ [2]

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا اونٹ بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ [3]

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿ اذا سمعتم الا قامة فامشوا الی الصلوة وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ وَلَاتُسْرِعُوْ ﴾ [4]

---

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورہ منافقون کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

[2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر۔

[3] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان۔

[4] بخاری کتاب الصلوۃ باب الی الصلوۃ ولیاتھابالسکینۃ والوقار۔

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے۔ مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا آہستہ چلنا' نگاہ کا جھکائے رکھنا' آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں' ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

﴿الهدى الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسة وعشرين جزء من النبوة﴾

نیک طور طریق' نیک انداز اور میانہ روی' نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

کیونکہ ان ہی اخلاق خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دل کا ہے' اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار گفتار شکل وصورت وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے' اسلام نے خصال فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا وقار۔ بولے خداوند میرے وقار کو اور بڑھا۔[1]

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَايَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (بقرہ۔۳۷)

(خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے۔ بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے' تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے صاحب کشاف نے ﴿لَايَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت واصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن امام رازی نے لکھا

[1] ادب المفرد باب الختان للکبیر۔

ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ انکی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی' اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے' پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ [1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے' اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی۔ ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا'' یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے' چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے' رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ نے دے دیا پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا۔ جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے' خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی' لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے' ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ سے خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے' مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھادو' میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا' لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا اسی لیے کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول

---

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶'۵۲۷۔

اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی ﴿لَا تَسْـئَـلُوا النَّاسَ شَيْئًا﴾ (تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا)

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا اگر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو [1] صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کردیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے، اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے، اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کردے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے، اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جارہے تھے جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے، اور اسی شان سے اسلام کا فرمانبردار رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کررہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوعبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امت محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراہۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالی نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ [1]

[1] مستدرک حاکم جلد اول ص ۶۲ کتاب الایمان علی شرط الصحیحین۔

شجاعت اور بہادری

قَدِیْرٌ (قدرت والا) قَادِرٌ، مُقْتَدِرٌ، قَوِیٌّ، جَبَّارٌ (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قَاھِرٌ جو ہر کسی کو دبا دے غَالِبٌ اور عَـزِیْـزٌ اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں۔ جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم' اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے اس لیے تعلیم محمدی نے بہادری وشجاعت کو سراہا' اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہئے' کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں' اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے

﴿ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۲)

اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں' وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آ پڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے' کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے' اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے۔ ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے۔

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴾ (انفال۔۲)

اے ایمان والو جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں' بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ''ایمان والے'' کہہ کر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی ''ایمان'' مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔

﴿ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴾ (انفال۔۲)

اور جوان کو اس دن پیٹھ دے گا مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملنا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

یہ تو سلبی تعلیم تھی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہئے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ﴾ (انفال۔۶)

اے ایمان والو جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ (فتح۔۴)

وہ کافروں پر زورآور ہیں۔

اشداء کا ترجمہ اس آیت میں زورآور، زورمند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾ (انفال۔۸)

اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور وقوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے مرعوب کرو۔

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ وقتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیراندازی مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے ورنہ معنی میں مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔[1] غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان واسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی متوحش ہو رہے تھے اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا۔

﴿ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ (انفال۔۱)

گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔

﴿ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾

(احزاب۔۲)

---

[1] تفسیر طبری آیت مذکورہ۔

جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں' ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں' جیسے کسی پر موت کی غشی آ جائے۔

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

﴿ فَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِىِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴾ (محمد۔۳)

جب اترے کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں تیری طرف جیسے ٹکٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے' سو خرابی ہو ان کی۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا۔

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ (منافقون۔۱)

اور جب تو انہیں دیکھے' تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے' جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں جو کوئی چیخ سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں' دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے تجیلے اور گھٹے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں' مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کرے۔ دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اگرچہ اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں اس بنا پر وہ اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

(۱) جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے' اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں' صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہئے۔

(۲) ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے' جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی' اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

(۳) خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے' اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلّت و کثرت:

تعداد کی قلت و کثرت پر جدوجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے۔ تعداد کو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان یقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے۔ اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔

﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً ۢ بِإِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۳۳)

کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو آمادہ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے۔

﴿ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ﴾ (مائدہ۔۴)

اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں۔

﴿ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُونَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴾ (مائدہ۔۴)

تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے' ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (انفال۔۲)

اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○ إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر' بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے' اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے' اور مدد اسی طرف سے آتی ہے۔

﴿ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ (انفال۔۱)

اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے' یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا' بلکہ ان کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوشخبری سنادی' فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

﴿ يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُونَ صٰبِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ

﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ (انفال۔۹)

اے پیغمبر! مومنوں کولڑائی کا شوق دلا۔ اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں' اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر وتوکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے' یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں۔

﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (انفال۔۹)

تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دوسو پر غالب ہوں' اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا غالب ہوں' اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمداللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے' اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا' اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے' جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو سال سے ہے کہ

﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (آل عمران۔۱۶)

ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔

﴿سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (انفال۔۲)

...... میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا' چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (احزاب۔۳)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (حشر۔۱)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے:

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے' اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے' اور نہ بُلائے آ سکتا ہے اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے غزوہ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا۔

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ﴾ (آل عمران۔۵)

اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا۔

﴿ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ (احزاب۔۲)

(اے پیغمبران سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے ،فرمایا

﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾ (آل عمران۔۱۶)

(اے پیغمبران سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں

﴿ لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

اگر یہ مرنے یا مارے جانے والے ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس لئے ان کے دل میں آتا ہے تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں۔

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی۔

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ (نساء۔۱۱)

پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس

سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پرہیزگار کے لیے بہتر ہے۔ تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہوگے موت تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ (آل عمران۔۱۸)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا، اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ:

میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے، اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ﴾ (توبہ۔۱۴)

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے، اللہ راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورہ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے۔

﴿ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (نساء۔۱۰)

تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں وہ اللہ کی رہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے۔

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ﴾ (آل عمران۔۲۰)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی وہ ان کو از سر نو اسی وقت دے

دی جائے گی‘ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو‘ وہ خدا کے پاس زندہ ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (آل عمران۔۱۷)

اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو‘ بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں‘ خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (بقرہ۔۱۹)

اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں جو فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے۔ اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی فرمایا۔

﴿تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (نساء۔۱۳)

چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال‘ سو اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے‘ تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے‘ ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو‘ ایک شخص بہادری دکھانا کے لیے لڑتا ہے‘ ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے‘ ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے‘ ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے‘ تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا

﴿مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [1]

جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا‘ خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو‘ تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ [2]

---

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ۔

[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار و جامع ترمذی۔

سوتم اپنا اجر پاچکے' اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جاچکا غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا ونمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے [1] کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمہ حق کا بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر وتبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض ناز وتبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے' خدا جس ناز وتبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے [2] کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب وداب قائم ہوتا ہے' اور دوستوں میں مستعدی وسرگرمی پیدا ہوتی ہے' ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر وغرور کے لہجہ میں کہا لو میں ابن اکوع ہوں حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے' جس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ حالت کا اقتضاء یہی تھا اور وہ اس ناز وتجبر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے' اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں [3]

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ نے خود عزم وثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا

﴿ أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب أنا ابنُ عبد المطلب ﴾

میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔ [4]

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا [5] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام تھے' آپ ﷺ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا خوف کی کوئی بات نہیں [6] ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے [7] بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں بزدلی بھی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے دوسری روایت میں ہے کہ

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور۔

[2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

[3] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴۔

[4] صحیح بخاری غزوہ حنین و کتاب الجہاد باب بغلة النبی ﷺ۔

[5] صحیح مسلم باب غزوہ حنین۔

[6] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب الحمائل و تعلیق السیف بالعنق۔

[7] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعة فی الحرب والجبن۔

آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے[1] ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرادینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔[2]

حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا' اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو[3] اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ ﴾[4]

یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

---

۱ بخاری کتاب الجہاد باب مایتعوذ من الجبن

۲ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأة والجبن

۳ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عندالقتال

۴ ایضا باب الجنة تحت بارقته السیوف وباب کان النبی ﷺ یقاتل اول النہار اخر القتال حتی تزول الشمس بخاری ج ۱ص ۴۱۶۔

استقامت

''استقامت'' کے لفظی معنی سیدھا رہنے یا سیدھے چلے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے' مشکلیں پیش آئیں' مخالفتیں ہوں' ستایا جائے' ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے۔

﴿ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ﴾ (حم السجدہ۔۱)

تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو' اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے' سیدھے اسی کی طرف چلے چلو' ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو' نہ رہ سے بہکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو۔

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (ھود۔۱۰)

تو (اے پیغمبر) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا تھا' ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے' اس موقع پر رسول اسلام اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے' ارشاد ہوتا ہے اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو' اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ (شوریٰ۔۲)

پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرما دیا اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہو گا اور نہ کسی چیز کا غم ہو گا۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (احقاف۔۲)

بیشک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے' پھر وہ (راہ پر) جمے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے' ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا' وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہو گا' ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ (حم السجدۃ۔۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر جمے رہے' ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں' ارشاد ہوا کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ [1] صحابہؓ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر حسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں' خود اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے' فرمایا۔

﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴾ (احزاب۔۲)

جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے' وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑجھڑائے گئے۔

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے' اس کے بعد ہے۔

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴾ (احزاب۔۳)

اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے' اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا' اور اس کو پورا کر دکھایا' ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے۔

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (احزاب۔۳)

ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا' اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے' اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا' اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا' اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی' فرمایا۔

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ

[1] ترمذی باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴾ (بقرہ۔۲۶)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی' اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی' سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہیں' ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا' اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی۔

﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ﴾ (بقرۃ۔۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے' احادیث [1] وسیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰؑ کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے یہودیوں نے ان کو ہر طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا' مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَیْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ﴾ (بروج۔۱)

مارے گئے گڑھے کھودنے والے' آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے' اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے' دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے اللہ پر ایمان لے آئے تھے۔

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے' خباب بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجئے۔ کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیتابی کا اظہار تھا' اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا' مگر یہ اس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا' اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر دیا جاتا تھا' مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔ [2]

رسول اسلامؐ کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہل تاریخ سے چھپا نہیں' ان ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں' آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ

---

[1] صحیح مسلم وسیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود۔

[2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے[1] حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو جلے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالوں پر لٹائے جاتے' پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آ ؤ اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں' خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا اور ابوطالب کے جواب میں کہا تھا اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے فرمایا چچا جان اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مر جائے یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو' الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت و حیات سے وابستہ نہیں' اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے۔

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور محمد تو ایک رسول ہے' اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے' پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے' اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ o وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ لڑے' تو پھر ان کو اللہ کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھو اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہئے اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے جس کا نام مداومت ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے' اس پر مرتے دم تک مداومت رہے' اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے' ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے' نماز پڑھنا انسان کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا

---

[1] ابن سعد جلد ۳ تذکر خبابؓ۔

کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں' فرمایا

﴿ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَo الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (معارج۔۱)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے' اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے' ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا فرمایا وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے[۱] خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے' اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔[۲]

---

۱ صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل۔

۲ صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں بعینہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ (الحجر۔۶)

پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو ہم تم کو تمھاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں کافی ہیں۔

یعنی اب مخفی طور پر دعوت توحید کا زمانہ گذر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا ہے اس لیے کھلم کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزاء کی مطلق پروانہ کرو بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ﴾ (مائدہ۔۸)

یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پرواہ نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھتا ہے لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا ''کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہئے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو''۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو اللہ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے ایسے شخص سے اللہ قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف ارشاد ہو گا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے' اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

﴿ افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جابر ﴾

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دوسری روایت میں ''کلمہ حق'' کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہیں' ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا' اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی' آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا' نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا' اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے' لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے'' [1]

صحابہؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا' یہ وہی تھے' جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا' اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے' لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا' اور دوسرے دن پھر جا کر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں''۔ [2]

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے' تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی' اس پر انھوں نے بے محابا دارو گیر کی' اور اس میں امیر معاویہ کی پرواہ انھوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا ''ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے''۔ یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔ [3]

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

[2] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذر۔

[3] ترغیب وترہیب منذری' ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی۔

استغناء

استغناء کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

اور جو (مقدور رکھ کے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہاں سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے‘ وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ (محمد۔۴)

اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذات بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئین اخلاق میں اس استغناء اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے‘ اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے‘ اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے‘ قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ (فاتحہ)

(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں‘ اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اللہ نے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے‘ فرمایا:

﴿ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ (آل عمران۔۱۸)

اور کیسا اچھا کارساز۔

﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴾ (نساء۔۱۱)

اور تیرا رب کارساز بس ہے۔

﴿ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴾ (اسرائیل۔۱)

میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ (نساء۔۱۱)

اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے۔

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ (زمر۔۴)

کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔

اس لیے کسی شاہ' امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے' وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اسی پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے۔

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (نساء۔۵)

اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (طہ۔۸)

اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں' مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی' اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں' اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم اللہ نے جو کچھ اس کو دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے' اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا' اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغناء و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے بلکہ روح اور قلب سے ہے' اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

﴿ ليس الغنى عن كثرة العروض ولكن الغنى غنى النفس ﴾ (بخاری' رقاق' باب الغنی غنی النفس)

دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے' بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے "تونگری بدل است نہ بہ مال"

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا' حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوذر! تمھارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا تو تمھارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا "بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی" [1] اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضاء و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے' مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی' یعنی اللہ انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جو ہر نفس میں پیدا ہوتا ہے' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے' [2] ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے ان کا سوال پورا کیا' لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے' اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا' جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا' جو شخص خودداری چاہتا ہے اللہ اس کو خوددار بناتا ہے' اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے' اللہ اس کو بے

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۴۔

[2] فتح الباری ج ۱۱ صفحہ ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمان الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس۔

نیاز کر دیتا ہے۔[1] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے اللہ اس میں برکت دیتا ہے، اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے، لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا۔[2]

فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے، اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے'[3] حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔[4]

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب فی الاستعفاف۔

[2] ترمذی کتاب الزہد۔

[3] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ۔

[4] مستدرک حاکم ج۴ ص ۳۵۲ کتاب الرقاق۔

رذائل

رذائل کے معنی:

رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے' جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں' جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے' بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں' یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام:

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں مثلاً اکثر ان کو مُنْکَرٌ (بری باتیں) اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فاحِشَۃٌ (فحش) سَیِّئَۃٌ (بُرا) سُوْءٌ (برائی) مَکْرُوْہٌ (ناپسندیدہ) خَطْأٌ (ناصواب یا بھول) اِثْمٌ (گناہ) عُدْوَانٌ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھناؤنا اور نفرت کے قابل ہے' اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں' فرمایا۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا .... وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو' ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے' بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے' اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی' اور بری راہ ہے.......... اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا' ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے' چنانچہ سورۂ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے۔

﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۱۱)

وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے' کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جارہی ہیں' اس سلسلہ میں ہے۔

﴿ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾ (عنکبوت۔۳)

اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے۔

﴿وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (توبہ۔۱۴)
اور منکر سے منع کرنے والے۔

﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران۔۱۲وتوبہ۔۹)
اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فَحْشَآءُ اور مُنکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے۔

﴿فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (نور۔۳)
وہ فحشاء اور منکر کرنے کو کہتا ہے۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

﴿تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (عنکبوت ۵)
وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشاء منکر اور بغی:

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں'فحشاء' منکر اور بغی۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل۔۱۳)

(مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے' اور فحشاء اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے' تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ ﷺ کی شرم وحیا کی وجہ سے اسلام لایا تھا' اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی' لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی۔[1]

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے۔[2]

قتادہ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاق حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کئے جاتے تھے' ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا اللہ نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو' اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے' جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔[3]

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں' فحشاء اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

---

۱ مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ۔

۲ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

۳ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

فحشاء کے معنی:

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔[1] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہو گئے ہیں قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴾ (اسرائیل۔۴)

اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ''فاحشہ'' (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی:

دوسرا لفظ ''منکر'' ہے۔ اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے وہ تو جانا پہچانا کام ہے اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے وہ منکر (ناشناسا) ہے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴾ (حجر و ذاریات)

لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے اس موقع پر قرآن میں ہے۔

﴿ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾ (یوسف۔۷)

---

[1] الصحاح للجوہری لفظ فحش و لسان العرب لفظ فاحش زیر ''فحش''۔

یوسف نے تو ان کو پہچان لیا' مگر وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے' یہ کیفیت بھی منکر ہے' فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ (حج۔۹)

اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں' تو کافروں کے چہروں میں تو منکر کو (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا' نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں' حملہ کر بیٹھیں۔

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے' اس کو منکر کہا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بلا شبہ ناپسند کرتا ہے' اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی:

تیسرا لفظ بغی ہے' جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں۔

﴿ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (ص۔۲)

ہم دو جھگڑنے والے ہیں' ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔

﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِى الْاَرْضِ ﴾ (شوریٰ۔۳)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ (شوریٰ۔۴)

راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں؟

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء' منکر اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفات ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ (اعراف۔۴)

اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے' ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے' دوسرے گناہ کے کام' اور تیسرے ناحق زیادتی' ان اخلاق ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے' اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں' اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں' اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے ایمان اٹھ جائے' اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔ [1]

رذائل کی ترتیب:

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جا سکتی ہے' ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فحشاء پھر منکر پھر بغی ۔

فَحْشَاء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے' جیسے ننگے رہنا' بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے' جیسے شوہر کا ظلم' باپ کی سنگدلی' اولاد کی نالائقی' اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے' جیسے چوری' قتل' ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفات ذمیمہ ہیں جن سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے' پھر وہ برائیاں ہیں' جو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں' اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

---

[1] منطقی اصطلاح میں فحشاء' منکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے' یعنی کسی بد اخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بد اخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی' یعنی ہر بد اخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاق ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر ہو جائے، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں، اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی ہوں وہ کم ہے، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے، جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا۔

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴾ (مریم۔۴)

اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا۔ حضرت موسیٰ نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ کے صدق نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ (مومن۔۴)

اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا، اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گذرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور طریق پر چلتے ہیں روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا؟[1] یہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

﴿ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

---

1. صحیح بخاری بدء الوحی۔

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر لا ڈالتے ہیں سنی بات' اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیا علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے' اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے اللہ کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے' ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَايَهْدِی مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ (زمر-۱)

بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے' احسان نہیں مانتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے' اور گناہ دوزخ میں' اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے" [1] حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا' جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے' وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا' اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا' جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔" (مسند احمد ج اول ص ۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے' جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہے' وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے' اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے' مگر رحمت الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کی بادسموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے۔ لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے' اور اس کے بعد یہودیوں' کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے' لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بناء پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اور اس پر اللہ کی لعنت کی جائے' مباہلہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴾ (آل عمران-۶)

پھر دعا کریں' پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

﴿ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ (نور-۱)

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وکونوا مع الصادقین، و جامع ترمذی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے' حق کا علم رکھ کر اس کے اظہار سے باز رہے' اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ ۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتَابِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان' اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لئے کھول کر کہہ دیا ہے' ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے' اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے' کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں' اس لئے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں' لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ' اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا ہوگا' چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے' فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (منافقین۔۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے' فرمایا کہ ''منافق کی پہچان تین ساتوں سے ہے' جب کہے جھوٹ بولے' جب وعدے کرے پورا نہ کرے' اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' [۱] لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں' لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں' جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معناً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں' بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں' جیسے

﴿ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (شعراء۔۱۱)

جھوٹ بولنے والا گنہگار۔

﴿ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ (زمر۔۱)

جھوٹ بولنے والا' احسان کا حق نہ ماننے والا۔

﴿ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ (مومن۔۴)

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وکونوا مع الصادقین' وما ینھی عن الکذب۔

بے باک جھوٹا۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے' کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا' اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا' کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس بات پر یقین کاہے کو آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا' وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں یا اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو' لیکن یہ کذب قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے۔ کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

﴿ بِمَآ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴾ (توبہ۔۱۰)

اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ جھوٹ بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی' قسم کھا کر اور وعدہ کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا' ایک قسم کا فریب تو ہے ہی' مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے۔

﴿ وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَكُمۡ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴾ (توبہ۔۶)

اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمھارے ساتھ لڑائی میں چلتے' وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا' اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے' فرمایا۔

﴿ لِيَجۡزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيۡنَ بِصِدۡقِهِمۡ وَيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ ﴾ (احزاب۔۳)

تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہوسکتا ہے' فرمایا۔

﴿ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴾ (علق۔۱) جھوٹی خطا کار پیشانی۔

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے۔

﴿ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعۡنٰكُمۡ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

انھوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ ﴾ (نساء۔۹)

یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے آپ کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟ فرمایا ''جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے'' [1] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زُوْر فرمایا ہے۔ [2]

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے ایک کمسن صحابی عبداللہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ ''یہاں آ تجھے کچھ دوں گی'' حضور نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو، ماں نے کہا اس کو کھجور دیدوں گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمھارا لکھا جاتا'' [3]

اس تعلیم کا منشاء یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہئے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کی تعلیم و تربیت سے بچے پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا، اسی سانچے میں ڈھلے گا اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب۔

[2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر۔

[3] ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے اور وہ انکار کرتے ہیں، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔ [1]

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطف صحبت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے، اس پر افسوس اس پر افسوس" [2] کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس شخص کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتبار سمجھتا ہے اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو" [3]

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (حج۔۴)

بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ" فرمایا کہ "شرک اور باپ ماں کی نافرمانی"۔ راوی کا بیان ہے کہ

---

[2] مسند احمد و طبرانی کبیر مجمع الزوائد ہیثمی ص ۲۴۰ باب فی ذم الکذب۔

[3] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

[4] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق۔

آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتہً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ''جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات'' اور برابر یہی کہتے رہے' یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے۔ [1]

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے' اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

اِفکؔ اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے' اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا۔ مشرک اللہ پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے' ان کو قرآن نے افک کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو بہتان لگایا تھا' اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ افک سے تعبیر کیا ہے (نور۔۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افک بڑے خبث طینت کا کام ہے' فرمایا:

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ﴾ (اشعراء۔۱۱)

اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلاتحقیق دوسروں سے کہتا پھرے' ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿ کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَاسَمِعَ﴾ (مقدمہ صحیح مسلم)

آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ ﴾

جھوٹ کے بڑے سننے والوں۔

کا خطاب دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ﴾ (مائدہ۔۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

[1] ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حقوق الوالدین۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں' انھیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لئے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے' اسی لئے قرآن پاک میں اس قسم کے کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے' یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے' جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ اللہ کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی لئے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گنہگار رہتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے' کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ [1]

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِىٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ﴾ (مائدہ۔۱۲)

اللہ تم کو تمھاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا' لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا' تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو' یا ان کو کپڑا دینا' یا ایک غلام آزاد کرنا' تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا' یہ ہے تمھاری قسموں کا اتار جب تم قسم کھا بیٹھو' اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لئے مقرر کیا گیا ہے تا کہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے' بعد کو غیر انسب معلوم ہو' تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے' اللہ نے فرمایا۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ (تحریم۔۱)

اللہ نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

اوراحادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گذشتہ یاموجودہ واقعات پرقسم کھانا جیسا کہ کہا جاچکا حقیقت میں گواہی اورشہادت ہےاورمعلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اورشہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے'اسی لئے ایسا شخص جو بات بات پرقسمیں کھاتا رہتا ہے' حد درجہ بے اعتبار'اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہےاوراس کو انسان کا بڑاعیب بتایا ہے'رسول کوحکم ہوتا ہے۔

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴾ (قلم-۱)

اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اوراس کا اعتبار کریں' لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اوراس کی بیقدری اور بےاعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کرجھوٹ بولتے ہیں'اسی لئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہےاور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے' منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پرکوئی افتاد پڑتی ہے توقسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشاء نہ تھا'ہماری نیت نیک تھی' اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کوتمھارے دل کی بات خوب معلوم ہے۔

﴿ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (نساء-۹)

پھر کیا جب ان کواپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے' پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اورملاپ کی تھی' یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کومعلوم ہے۔

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہےاورزبانوں پر کچھ ہے'ایسےلوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کوجھوٹ اورجھوٹ کو سچ بنا کرمتعلق اشخاص کوخوش کردیں' اللہ فرماتا ہے کہ اگران کے ایمان ہوتو ان کو چاہئے کہ سچائی اختیار کر کے اللہ اوررسول کوخوش کریں۔

﴿ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ (توبہ-۸)

تمہارے (مسلمانوں کے) آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں' تا کہ وہ تم کوراضی کرلیں' اوراللہ اوررسول کوراضی کرنا زیادہ ضروری ہے' اگروہ ایمان دار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اوراس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں۔

﴿ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ ﴾ (توبہ-۱۰)

اللہ کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا' حالانکہ انھوں نے بےشک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا' اللہ نے فرمایا کہ تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ اللہ کی قسم کھا جائیں گے۔ **سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ**(توبہ۔۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا' اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ ﴾(توبہ۔۱۲)

تمھارے آگے قسمیں کھاتے ہیں' تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ' تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی' اللہ نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی' فرمایا۔

﴿ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ﴾ (توبہ۔۱۳)

اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے۔

﴿ وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾ (مجادلہ۔۳)

وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿ اِتَّخَذُوْآ اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً ﴾ (مجادلہ۔۳ومنافقون۔۱)

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ' اور اس کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

﴿ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا ط اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ہ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ ﴾ (نحل۔۱۳)

اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو' اور تم نے اپنے پر اللہ کو ضامن بنایا ہے' بے شک اللہ تمھارے کاموں کو جانتا ہے' اور اس عورت کے جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی' تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر رہو۔

اللہ کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا اللہ کے مقدس نام کی تحقیر ہے' اسی لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا اللہ کو ضامن ٹھہرایا' اس لئے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو' پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا' جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے اللہ کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا اللہ کے کا نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کی بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے یعنی غصب اور جھوٹ' اور وہ بھی اللہ کے پاک اور مقدس نام پر' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ (آل عمران۔۸)

بے شک جو لوگ اللہ کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں' آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں' نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں' اور نہ ان کو پاک کرے گا' اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے' مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔ اشعثؓ بن قیس صحابی نے کہا ''اللہ کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی' اس نے میری ملکیت سے انکار کیا' میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا' حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں' تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں عرض کی یارسول اللہ ﷺ وہ تو اب قسم کھا جائے گا' اور میری چیز لے لے گا' اس وقت یہ آیت اتری'' [1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں' اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا ''تین آدمی ہیں' جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہ دیکھے گا' نہ ان کو پاک کرے گا' اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''۔ صحابیؓ کہتے ہیں' میں نے کہا کہ وہ لوگ جو ناکام ہوئے اور خسارے میں پڑے' وہ کون ہیں یارسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے' (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم وابوداؤد وترمذی و نسائی وابن ماجہ) بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شان نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آ جائے اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا''۔ صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو' فرمایا' درخت (اراک)

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذ ور وابن جریر۔

کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو [1] حضرت انس ؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''بڑے بڑے گناہ یہ ہیں' اللہ کا شریک ٹھہرانا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' کسی بے گناہ کی جان لینا' اور جھوٹی قسم کھانا'' [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹی قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا'' [3] چہرہ کی خصوصیت شاید اس لئے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھٹائی دکھائی' جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں' اس لئے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے' فرمایا ''جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے' لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے'' [4] روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی' لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے' حضرت قتادہ ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو' کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے' پھر بے برکتی ہو جاتی ہے'' کیسے بلیغ فقرے ہیں: فانہ ینفق ثم یمحق (مسلم و نسائی و ابن ماجہ) جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے' قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے'' [5]

❁❁❁

---

۱ صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین۔
۲ سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔
۳ سنن ابی داؤد کتاب الایمان۔
۴ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی' منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔
۵ ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے' اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے' فرمایا۔

﴿ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔

اور جس کی باز پرس اللہ فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا' فرمایا۔

﴿ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴾ (توبہ۔۱۰)

پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا' اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے' اس لئے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا' اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ "منافق کی تین نشانیاں ہیں' جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے خلاف کرے' جب امانتدار بنایا جائے تو خیانت کرے" (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) "اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو' روزے رکھتا ہو' اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے"۔ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے جب تک اس کو چھوڑ نہ دے' جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے' جب بولے جھوٹ بولے' جب معاہدہ کرے خلاف کرے' جب جھگڑے گالی بکے۔[۱]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمھارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں' جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو' اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو"۔[۲]

[۱] ترغیب وترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق۔

[۲] احمد' حاکم' ابو یعلی' بیہقی' منذری باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اُس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی وملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا، اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَخُوۡنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ وَتَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (انفال۔۳)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے، ایمانداری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین وملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ ورسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چوری چھپے امداد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ "منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے، تو وہ اس میں خیانت کرے"۔[1] ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان جائے گا اور اس کے پیچھے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے، اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازبؓ صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهۡلِهَا ﴾ (نساء۔۸)

---

[1] صحیحین وغیرہ۔

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے' پھر جو اس کے بعد آئے گا' پھر جو اس کے بعد آئے گا' پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے' خیانت کریں گے' امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے"۔ [2]

آنحضرت ﷺ جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے' ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا' کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے"۔ [3]

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے' وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے' مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا' فرمایا۔

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ (مائدہ۔۳)

اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔

یعنی ان کی کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے' حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی' اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا۔

﴿ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ﴾ (یوسف۔۷)

تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی' اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی' ان کی بیوفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں' اللہ نے فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا﴾ (تحریم۔۲)

اللہ نے کافروں کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی' یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں' تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی' تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو اللہ سے ذرا نہ بچا سکے۔

یہ دل کی خیانت تھی۔

---

[1] مسند احمد بیہقی منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد۔
[2] صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور۔
[3] ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ منذری باب مذکور۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے' بلکہ ایک ایک عضو سے ہوسکتی ہے' یہاں تک کہ چشم وابرو کے اشاروں سے ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے' فرمایا

﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ (مؤمن۔۲)

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغا بازی

غداری اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں' اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے' ان کے ذکر میں اللہ فرماتا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴾ (انفال۔۷)

جن سے تو نے معاہدہ کیا' پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں' اور وہ تقویٰ (اللہ کا لحاظ) نہیں رکھتے' سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں' شاید وہ عبرت پکڑیں' اور اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے' اللہ کو دغا باز خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے' مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں' ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے' دوسری یہ کہ یہ غداری' دغا بازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا' پھر ان کو دوبارہ تمھارے قابو میں لے آئے گا' فرمایا۔

﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (انفال۔۱۰)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں' تو اللہ نے ان پر قابو دے دیا' اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اللہ سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے' تو اللہ تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے' اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے' اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا" [1] یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے' ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا" [2] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں' حاکموں' افسروں' سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے

---

۱ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

۲ ایضاً۔

قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مروا دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔[1]

اللہ فرماتا ہے۔

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (مائدہ۔۱)

اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمروؓ بن عنبسہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر بدعہدی نہیں۔ امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے"۔ یہ سن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔[2] غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

❁❁❁

---

[1] سنن ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد۔

[2] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابیؓ کے گھر میں چوری کی۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی الٰہی نے دفعتہً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ [1] دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ آپ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا۔ اس وقت یہ وحی آئی۔ [2] بہرحال واقعہ جو کچھ ہوا امر مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں۔

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ۝ یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا ﴾ (نساء۔۱۶)

ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو اللہ نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر، اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور اللہ سے قصور معاف کرا، بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گنہگاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے۔

﴿ وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ﴾ (نساء۔۱۶)

---

۱ جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء۔

۲ تفسیر طبری سورۂ نساء آیت انا انزلنا الیک الکتاب۔

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے۔پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے۔پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں اور اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔اللہ نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی۔

﴿ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ﴾ (ممتحنہ۔۳)

اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے۔اللہ نے فرمایا۔

﴿ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِينًا ﴾ (احزاب۔۷)

اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے اس لئے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اس کو کوڑے مارے جائیں۔

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمٰنِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا ﴾ (نور۔۱)

اور جو لوگ شریف بیویوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ، تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں مگر جنہوں نے توبہ کی۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ

بے گناہ ہو یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔[۱] یہ گویا قذف یعنی تہمت بے جا کی مثالی سزا ہوگی۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے [۲] یعنی اس سے بچنا چاہئے۔

۱ سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

۲ سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو اسی لئے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہئے یہ لفظ کہے ہیں مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ (قلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمۡ فَاسِقُۢ بِنَبَإٖ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ قَوۡمَۢا بِجَهَٰلَةٖ فَتُصۡبِحُواْ عَلَىٰ مَا فَعَلۡتُمۡ نَٰدِمِينَ ﴾ (حجرات۔۱)

اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو۔ کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو اللہ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں بالخصوص عزیزوا قارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں، پھر خود ہی فرمایا۔

﴿ المشاؤن بالنميمة المفسدون بين الاحبة ﴾ (مسند احمد ج ۶ صفحہ ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)

جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ [1]

صحیح مسلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ الا انبئكم ما العضة هى النميمة القالة بين الناس ﴾

کیا میں تم کو بتاؤں کہ عضہ کیا ہے؟ وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں۔ اس لئے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لئے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بیوی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لا یستتر عن بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل عن نجاستہ البول۔

میں علیحدگی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے۔

﴿ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ﴾ (بقرہ۔۱۲)

اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ ہدایت کی تھی۔

﴿ لا يبلغني احد من اصحابي عن احدشيئًا فاني احب ان اخرج اليكم و انا سليم الصدر ﴾ [۱]

میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے۔ بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے، اس کو ناگوار گذرتی ہے۔ بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگتے رہتے ہیں تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اسی بنا پر اہل عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتش فتنہ و فساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق "حمالة الحطب" یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراق سمع کرتے ہیں یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿ لا يدخل الجنّة قتات ﴾ [۲]

جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے اسی لئے عربی زبان میں چغل خوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں اور ادھر کی اُدھر لگانے کے لئے

---

۱ مسلم کتاب البر وصلۃ باب تحریم النمیمۃ۔

۲ ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث۔

چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایہ'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ تحریر و کتابت اور رمز و اشارات سے چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں۔یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ ''فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا'' چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے ''ترک مالا یعنی'' کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل و خونریزی تک کی نوبت پہنچتی ہے۔اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے۔اگر امراء کے درباروں میں تملق و خوشامد کے لئے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے۔اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔فرمایا ''ان پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا''۔[1]

اس حدیث کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔چنانچہ افک عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات۔

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ (نور۔۲)

جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل درنقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں کشف عورت اور کشف عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض وانتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے شروفساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابل اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ٥ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ٥ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ﴾ (قلم۔۱)

اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ بدکار ہے۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (حجرات-۲)

مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (اللہ کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جا سکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے اس لئے جو چیز اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مر جانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص رودررو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا

نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳۔ لوگ شدت محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے اس سے اس کی سخت قساوت وسنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کی بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے اور صرف رمز واشارہ سے کام لینا چاہئے۔ اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شب معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت وآبرو لوٹ لیتے تھے۔ [1]

اعمال اور اعمال کی جزاوسزا میں مناسبت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالم برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔ [2]

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاوسزا کی مناسبت ظاہر ہے۔ مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے۔ اس لئے یہ بدبو اسی مردارخوری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر وتفضیح کی جائے۔ اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست وگندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلاتشبیہ وتمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا اور اللہ جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کردے گا۔" [3]

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

[2] ادب المفرد باب الغیبۃ۔

[3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

لغت کے رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے'' کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی۔ لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب وشتم میں داخل ہے۔

اس طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعے بھی غیبت کی جا سکتی ہے۔ کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لئے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ [2]

اس طرح چشم وابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ ﴾ (قلم۔۱)

(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (اِدھر کی اُدھر اُدھر کی اِدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴾ (ھمزہ)

ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ھمز' سامنے اور لمز' پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

۲۔ ھمز' خاص طور پر لوگوں کی نسب کی برائی بیان کرنا۔

۳۔ ھمز' ہاتھ کے اشارے سے اور لمز' زبان سے غیبت کرنا۔

۴۔ ھمز' زبان سے اور لمز' آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا

۵۔ ھمز' برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

[2] ایضاً۔

۶۔ لمز، آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے۔لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت وشرمندگی ہو اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔قرآن پاک میں کافروں مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغہ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے۔اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں وہ اس لئے کہ انکی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے قرآن پاک کا چھٹا پارا اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ (نساء۔۲۱)

اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف وکرم کے ساتھ گفتگو کی[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہ سلطانی میں فریاد کرنا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے لصاحب الحق مقالا۔

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرض احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

(۳) فتویٰ طلب کرنا اسی بنا پر حضرت ہندؓ بنت عتبہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی (اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا)

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر۔

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو بئس ابن العشیرہ (قبیلہ کا برا آدمی) کہا تھا۔

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو' مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو' مثلاً اعمش یا اعرج' کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا' رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابیؓ کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا۔

دورخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہئے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہئے بلکہ یہ بداخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے، اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ''ہم لوگ امراء اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں''۔ بولے ''ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے''۔[1] اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے،

﴿ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴾ (بقرہ۔۲)

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں، اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لئے وعید شدید آئی ہے، مثلاً فرمایا ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے، اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور''۔[2]

ایک اور حدیث میں فرمایا:

''دنیا میں جس کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔''[3] یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری باب ما قیل فی ذی الوجہین۔

[2] بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم و مالک۔

[3] ابوداؤد کتاب الادب باب ذی الوجہین۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کام میں بد نیتی ہی بد نیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے۔ اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ﴾ (حجرات۔۲)

اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا:

تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو، اور نہ آپس میں حسد اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔[1]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے، وہ آپ ﷺ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھ اور واپس پھرنے لگے، آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔[2]

❁❁❁

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک، باب تحریم الظن۔

[2] صحیح مسلم باب انہ یستحب لمن روی خالیا بامراہ یقول ھذہ فلانہ۔

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لئے ارباب قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔

بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے [1] اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے۔

﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (آل عمران۔۱۹)

اور جو اپنے کارناموں پر اتراتے ہیں، اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتے ہیں، تو ان کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے، اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے۔ [2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ کے اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کر دیا۔ [3] ایک اور موقع پر ایک

۱۔ صحیح بخاری تفسیر آل عمران۔

۲۔ فتح القدیر شوکانی۔

۳۔ صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح۔

صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا ''تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی' اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو' اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے''۔[۱]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا' اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا' اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہیں لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں' تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو''۔[۲] ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے' آپ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں' آپ نے فرمایا ''اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو''۔[۳]

❁❁❁

---

۱ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور۔

۲ صحیح مسلم و ابوداؤد باب کراہیۃ التمادح۔

۳ باب یحثی فی وجوہ المداحین۔

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت' بددیانتی' بے مروتی' بعض دفعہ بے رحمی' بدسلوکی اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص' طمع' لالچ' تنگ نظری' کم ہمتی' پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا' ننگوں کو پہنانا' محتاجوں کو دینا' یتیموں کی خبرگیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا' ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں' جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبریلؑ کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بناء پر دلایا وہ یہ ہیں۔

''یارسول اللہ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں' غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں' مہمانوں کو کھلاتے ہیں' اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں''۔ (صحیح بخاری' باب بدءالوحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی ''بخیل'' نہیں ہوتا' ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزاوسزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں' کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا۔ سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے' اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے' ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ہو' تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھاتے تھے' مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے' اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزاوسزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴾ (مدثر۔۲)

تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی' کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے' اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے' اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزاوسزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزاء وسزا کا قائل نہیں' وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کرسکتا' یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے دہرایا گیا ہے' فرمایا۔

﴿ أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴾ (ماعون)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اس دنیا میں پانے کا مستحق رہتا ہے، اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا اللہ کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں ہوسکتی۔

اور ایک مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کا تذکرہ کیا جس کی روزی زیادہ نہیں ہے، اس لئے اس کو اپنے اللہ سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (الفجر)

یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے، اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے، اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو، اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورۂ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو اپنی حیات جاوید کی اکسیر جانتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ ان کی بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا، اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیال خام ہے، فرمایا

﴿ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ﴾ (ھمزہ)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن گن کر رکھا اس کو، سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں، وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کار خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے۔

﴿ كَلَّآ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴾ (معارج۔۸)

ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے، کھینچ لینے والی کھال، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا، اور اکٹھا کیا اور سینتا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لئے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے، اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو اللہ نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی

کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے' فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (توبہ۔۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں' اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے' جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا' پھر اس سے ان کی پیشانیاں' کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا' تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے' اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہئے' اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں۔

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (آل عمران۔۱۸)

اور جو لوگ اس مال کو جو اللہ نے اپنے مہربانی سے ان کو دیا ہے' روکے رکھتے ہیں' وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں' بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے' جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے' وہ قیامت کے عالم مثال واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا' حدیث میں ہے کہ "یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا"۔[1]

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور اللہ کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی' اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِنِ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾ (حدید۔۳)

اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا' جو آپ بخل کرتے ہیں' اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

اور جس سے اللہ محبت نہ کرے اس سے کون محبت کرسکتا ہے' اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے' اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے' اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال ودولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کی نگاہوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے' جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے' یہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا' اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی اللہ جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے' تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا' کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے' اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گذر چکے ہیں' جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے' چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی یہ انجام ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی' اللہ نے فرمایا:

﴿ اَوَ لَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ﴾ (قصص۔۸)

کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔

زمانہ محمدی کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

﴿ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴾ (لہب)

ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہوسکتا' جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے' بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے' جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ (محمد۔۴)

ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جارہا ہے' تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے' اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے' اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے' نہ اچھا پہننا' نہ قرینہ کا گھر' نہ عزت نہ آبرو' ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے' ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے' فقراء اس کے لئے بددعا کرتے ہیں' یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے' ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ

سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے چور اس کے درپے ڈاکو اس کے لاگو زہر وہ پاتا ہے حملے اس پر ہوتے ہیں مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا' لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے سے اس کو اڑا دیا' بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے' وہ اس مال مفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس وقلاش ہو جاتی ہے۔

اللہ اپنے رسول کی زبانی فرماتا ہے۔

﴿ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰیo وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰیo فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیo وَمَا يُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ﴾ (لیل)

اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا' اور (اللہ کی یا نیکی کی باتوں کی) پروانہ کی' اور اچھی بات کو جھٹلایا' تو ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان بنائیں گے' اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو اللہ اس کے لئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے' وہ بری عادت وخصلت اور برے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے' اور ان کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے' بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے' ننگا وہ رہتا ہے' میلا وہ رہتا ہے' مصیبتیں وہ جھیلتا ہے' راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا' دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا' عزیز واقارب دوست واحباب سے اس کی مسرت نہیں ہوتی' وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں' پھر جب وہ کسی افتاد یا مصیبت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی' اس وقت افسوس آئے گا' تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے۔

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (منافقون۔۲)

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے' اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا' یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا' اس کے لئے سامان پہلے سے چاہئے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں' خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے' وہ کریں گے' مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں' اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں' ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَo فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ (توبہ۔۱۰)

اوران میں کوئی ایسا ہے جس نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکو کاروں میں سے ہوں گے' پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔

اللہ فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کرلیا۔

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (توبہ۔۱۰)

تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کردیتی ہے' شاید اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں' بخل اور بدخلقی'' [۱] رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی اللہ سے دعائیں مانگا کرتے تھے' ان میں سے ایک بخل بھی ہے' فرمایا کرتے تھے کہ ''خداوندا میں بخل' کسلمندی' کبرسنی' قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں'' [۲]

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات ومبرات کی ترغیبات شریعت محمدی میں اسی لئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک وصاف رہیں۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال ودولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ اللہ نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے' مثلاً کسی کو علم دیا ہے' کسی کو عقل دی ہے' کسی کو جسمانی قوت دی ہے' تو جو لوگ اللہ کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں' جس کو علم ملا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے' جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے' اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے۔

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۱۶)

اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا [۳] اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا' اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے' اللہ کے حق اور بندے کے حقوق کا اجمالی مجموعہ۔ نماز اور بندوں کے حقوق کے مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے' دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجاآوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے

﴿ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ○ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ ﴾ (مدثر۔۲)

کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی' کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے' اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔

---

[۱] جامع ترمذی۔
[۲] صحیح مسلم۔
[۳] مشکوٰۃ کتاب العلم۔

پہلا گناہ حقوق الٰہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾

(ماعون۔۱)

پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں، اور چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، یہ حقوق الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص وطمع

حرص وطمع یالالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو۔عربی میں اس کو شح کہتے ہیں۔جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے۔خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اس لئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں یا ایک شخص کی کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے لئے اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا، عشرتکدہ بن جائے گا۔میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے۔

﴿ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴾(نساء۔۱۹)

اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے۔جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی۔فرمایا:

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴾ (تغابن۔۲)

اور خرچ کرو اپنے لئے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچ گیا وہی کامیاب ہیں۔

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔

﴿ وَيُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ ط وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴾ (حشر۔۱)

اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگر چہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

اسی کا نام ایثار ہے یہ ہر قوم کی دینی ودنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا جب تک حرص وطمع کا خاتمہ نہ ہو۔اسی لئے اللہ نے فرمایا جو حرص وآزار سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے کیوں کہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں۔ایک بخل اور

دوسری حسد۔فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ (نساء۔۵)

اوراس کی ہوس نہ کروجس میں اللہ نے ایک کودوسرے پر بڑائی دی ہے۔مردوں کے لئے ان کی کمائی ہے اورعورتوں کے لئے ان کی اوراللہ سے مانگواس کے فضل میں سے حصہ۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرااس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی کاش خود اسے ملتی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض وکرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہئے۔اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا۔اس تعلیم پرعمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی۔ساتھ ہی دوسرے پرحسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔اسی لئے فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ، لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (حجر۔۶)

اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اورقرآن جس کا درجہ بڑا ہے۔تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پرمت پسارجو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کوقرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص وطمع کا جذبہ ہے جوایک کودوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پرابھارتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ’’حرص وطمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا۔اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اورحرام کوحلال سمجھا۔‘‘ [۱] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔صحیح ابن حبان اورحاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔فرمایا ’’حرص سے بچو کیوں کہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا۔اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اوراسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کوحلال سمجھا‘‘۔ [۲] آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا’’حرص سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا۔اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا۔اسی نے ان کو فسق وفجور کے لئے کہا تو انہوں نے فسق وفجور کیا‘‘۔ [۳] آنحضرت ﷺ نے فرمایا’’انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اورگھبرادینے والی نامردی ہے۔‘‘ [۴] حریص آدمی اس لئے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے میرے پاس نہیں۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اورکڑھن میں رکھنے والی فرمایا۔نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

---

[۱] صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔

[۲] صحیح ابن حبان ومستدرک حاکم۔

[۳] صحیح ابن حبان وابوداؤد کتاب الجہاد باب الجراۃ والجبن۔

[۴] ابوداؤد وحاکم۔

[۵] نسائی۔

''ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔'' ۵ سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر' توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی' بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ''انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص۔'' ۱ کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے۔ ۲

❀❀❀

۱ ترمذی۔

۲ ترمذی وصحیح ابن حبان، وطبرانی، وابویعلی، وبزار (منذری ۲ صفحہ ۲۳۸)۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔ اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصری آیت میں بیان کر دیا ہے۔

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْآ اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ (نساء۔۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے۔ یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے یا رشوت لے یا سود کھائے غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں''۔ [۱] جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے۔ آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں۔ [۲] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا ''جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ اس پر غضب ناک'' ہوگا۔ [۳] ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھا لی تا کہ وہ ظلم سے مال لے لے تو اللہ سے جب وہ ملے گا تو اللہ اس سے منہ پھیر لے گا''۔ [۴]

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ''غصب'' کہتے ہیں۔ غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا:

۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشا فلیس منا۔

۳۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

۴۔ صحیح کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴾ (کھف۔۱۰)

وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کردوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا ﴿طوقه الله فی سبع ارضين ﴾[1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا۔ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔[2]

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے کیوں کہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے''۔[3]

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں۔

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ تا کہ کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعوی اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پاکر ان کا مال خلاف انصاف نہیں کھانا چاہئے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ (نساء۔۱)

بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض' یہ عبارت کئی طرح سے ہے فی سبع ارضین' من سبع ارضین، الی سبع ارضین۔
[2] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور۔
[3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا۔

﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (مائدہ-۶)

اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔سزا ان کی کمائی کی تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے۔پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے۔اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی ضروری سمجھی۔سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیویوں سے لیا جاتا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''وہ چوری نہ کریں گی''۔فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لئے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔فرمایا تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو۔[1] اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے۔اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے۔حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔آپ نے فرمایا ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری

---

[1] صحیح بخاری کتاب النفقات۔

اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی' جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔ [1]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

چوری کا گناہ بھی اسی لئے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا' یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے' وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو اللہ بھی ہم کو نہیں دیکھتا' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا'' [2]

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے' مگر حق کے ساتھ'' [3] یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو' یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو' یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَـٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَـٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ﴾ (نساء۔۵)

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ' لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے' جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہے۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی' یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی' اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں' اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں' اللہ کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔'' (ابوداؤد کتاب الحدود)

ایک صحابیؓ ایک چادر سرہانے رکھ کر سو رہے تھے' ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا' وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی' کیا تیس درہم کے لئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا' میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی' اور قیمت اس کے ذمہ رہی' آپ نے فرمایا مجھ تک

---

۱ صحیح بخاری کتاب الحدود۔
۲ صحیح بخاری کتاب الحدود۔
۳ ایضاً۔

معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کرلیا۔[1]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا' نماز سے فارغ ہوکر آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرالیتا تھا' اور اگر مالک ہشیار ہوجاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا' اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا' آپ نے فرمایا میں اس نے کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔

[1] ابوداؤد کتاب الحدود۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے' لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا' تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے' جس سے ہر وقت کام پڑتا ہے' اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں' اور جس سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے' جس کا منشاء یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے' یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے اللہ نے دنیا میں قائم کیا ہے' اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے' جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے' وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے' فرمایا۔

﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ○ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ○ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾ (رحمان۔۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی' کہ مت زیادتی کرو ترازو میں' اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو' اور مت گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تلتا ہے' اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے' جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے' وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے' اور یہ بھی چوری ہی ہے' اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں۔ حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی' اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے' حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں۔

﴿ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ (شعراء۔۱۰)

اور پورا بھر دو ناپ' اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں' جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر میں آباد تھے۔

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ○ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ (ھود۔۸)

اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو' میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں' اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں'

اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو' اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے' یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے' اور یہ بالآخران کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے' یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھا لیں گے' مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی یہ نصیحت پھر سورۂ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

﴿ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (اعراف۔۱۱)

تو ناپ تول پوری کرو' اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں' اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو' یہ تمہارے لئے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی' اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (انعام۔۱۹)

اور ناپ تول کو پورا کرو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے۔

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ (اسرائیل۔۴)

اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو' اور سیدھی ترازو سے تولو' یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے' مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا' سورۂ مطففین میں ہے جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے' اس بیماری کا علاج بھی بتایا گیا ہے' فرمایا۔

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (مطففین۔۱)

خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی' جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں' اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں' کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان کو اٹھایا جائے گا' جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو اس سے کوئی چیز دوسرے ساتھیوں سے چھپا کر لینا غلول کہلاتا ہے' مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں' غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے' جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے' یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے' اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے' لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوسکتا' دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں' اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے' تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے' اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا اور چونکہ انبیاءؑ بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں' اس لئے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے' فرمایا۔

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔

پھر فرمایا۔

﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾

(آل عمران۔۱۷)

اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا' پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوہ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا' خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القری پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا' مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو' یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے' لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا' اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا' یہ دیکھ کر حضور نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے' آگ کا۔ [1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی' جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا' آپ نے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو' یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا' اور سمجھے کہ کوئی بات ہوئی ہے' یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا تمھارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے' صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔[۱]

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے' سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے' پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا' اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا' اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا' بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا' ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ یہ ہم نے لوٹا تھا' فرمایا کیا تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی' پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے' اس نے معذرت کی فرمایا ''تم اس کو قیامت میں لے کر آنا' میں نہیں قبول کرتا۔''[۲]

عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں' فرمایا ''اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو' وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا تو وہ ''غلول'' ہے۔ وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔''[۳]

❁❁❁

---

۱ ابوداؤد کتاب الجہاد' باب فی تعظیم الغلول۔

۲ ابوداؤد کتاب الجہاد' باب فی تعظیم الغلول۔

۳ سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے' رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے۔ [1]

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے' اہل غرض ان کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے' اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا' اس پر آنحضرت ﷺ نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ [2]

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے' اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیئے تھے' اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے' قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے' اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈالتے دیتے تھے۔ [3] چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک سبب یہی رشوت خوری تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۲۱)

اللہ نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں' اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا' نہ ان کو پاک صاف کرے گا' اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔

''پیٹ میں آگ بھرنا'' اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آ کر اللہ کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے' اس لئے یہی سزا ان کو ملے گی' ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں' لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے' چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے' فرمایا۔

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا

---

۱ مجمع البحار علامہ فتنی۔

۲ ترمذی باب ماجاء فی کراہۃ مہر البغی۔

۳ صحیح بخاری رجم زانی۔

كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (مائدہ۔۹)

اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں' کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے' کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (مائدہ۔۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ۔۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ' اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ' تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے' رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ''رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے' [۱] رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے' اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔''

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی' جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے' وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو' یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی' آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کئے اور کہا کہ یہ قبول کرو' اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا' ''اے یہودیو! اللہ کی قسم تم اللہ کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو' لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا' اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے' ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے''۔ یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ ''یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔'' [۲]

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔ [۳] ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے' اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے' یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی' حمد وثنا کے بعد فرمایا۔

''عامل کا کیا ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے' تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں

۱۔ ابوداؤد وکتاب الاقضیہ۔

۲۔ موطا امام مالک کتاب المساقات۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الاقضیہ وکتاب الجہاد۔

بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ گائے، بکری جو ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا "خداوند میں نے پہنچا دیا" [1]

اس آیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

[1] صحیح بخاری باب ہدایہ العمال۔

سودخوری

سودخوری حرص و طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص و طمع تو یوں کہ سودخوراس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آجائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا' اور نہ کسی کار خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودخوری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے' اور ظلم یوں کہ وہ سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا' اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا۔

﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۸)

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو تو یہ تمھارا ظلم ہے' اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے' اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی' وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے' یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا' اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے۔

﴿ وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ (نساء۔۲۲)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے' اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جارہی تھی' ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴾ (بقرہ۔۳۸)

جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں' یہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے' اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے' تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا' اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے' اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں وہ دوزخ میں رہیں گے' اللہ سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیار نہیں کرتا۔

قیامت میں سودخور کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی' دنیا میں سودخوروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا' تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے' آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سودخواروں کو ناشکرا گنہگار ٹھہرایا ہے' کیونکہ اللہ نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا

کہ اس سے وہ کار خیر کرتے‘ غریبوں کو دیتے‘ مستحقوں کو بانٹتے‘ مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے‘ جیسے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ‘ اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرضداروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا‘ تو اس پر یہ آیتیں اتریں‘ جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ٥ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۳۸)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا خیال کرو‘ اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو‘ اگر تم واقعی مومن ہو‘ تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لئے ہشیار ہو جاؤ‘ اور اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارے لئے تمہارا اصل سرمایہ ہے‘ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے‘ اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو‘ اور معاف کر دینا تمھارے لیے سب سے اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو‘ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے‘ پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب اللہ کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو اللہ کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے‘ جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو‘ مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے‘ اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی‘ یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا‘ اللہ نے فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

اے ایمان والو! (اصل سے) دو گنا چو گنا سود مت کھاؤ‘ اور اللہ سے تقویٰ کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ‘ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے‘ وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رویاء صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا ”میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے‘ اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے‘ اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارہ پر کھڑا ہے‘ پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں

چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خور ہے [۱]

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے، اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ [۲]

❋ ❋ ❋

---

۱ صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین و کتاب التعبیر باب تعبیر رویا بعد صلاۃ الصبح۔

۲ ابوداؤد کتاب البیوع۔

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیمہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے' پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں' اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے' [1] لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی' شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا' بیویاں شوہروں [2] کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں [3] کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی' مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا' لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی' کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ [4] اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے' ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے' ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کئے جاتے' ان کو سب مل کر کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی' پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں' اللہ نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بڑی نعمت ہیں' لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو' فرمایا:

﴿ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (نحل۔۹)

اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے' تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی' اس میں ان لوگوں کے لئے اللہ کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں نشہ کو "رزق حسن" کے مقابل میں رکھا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ نشہ "رزق حسن" [5] نہیں ان آیتوں میں درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں' [6] اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلایشوں کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے' یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا' حکم ہوا۔

---

۱ لوقا۔۱۵۔

۲ سبعہ معلقہ میں قصیدہ الاہبی بصحنک۔

۳ صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

۴ سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ۔

۵ تفسیر کبیر امام رازی۔

۶ مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نساء۔۷)

تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا' کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی' اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا' اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے لوگوں کے دل میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ (بقرہ۔۲۷)

(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوے کے بارہ میں پوچھتے ہیں' کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں' اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے' صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے' لوگ کھاتے پیتے ہیں' دوسروں کو بھی ان کی بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے' لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا' اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے' آخر یہ آیت اتری۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۱۲)

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے کام ہیں شیطان کے' سو ان سے بچتے رہو' شاید تمھارا بھلا ہو' شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس میں شراب اور جوے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے' پھر اب تم باز آتے ہو۔

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا' یا اللہ! ہم باز آ گئے [1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے' اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔ [2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں' اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے' دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے' ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارہ ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے' اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے' یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور

---

[1] ابوداؤد' اشربہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

برے کاموں میں شمار کیا ہے اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مرگیا تو فرمایا۔

﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ﴾ (قصص۔۲)

یہ ہوا شیطان کے کام سے۔

یعنی بہت ہی برا کام ہوا اسی طرح اس آیت

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب جوئے بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کرکے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے کون نہیں جانتا شراب خوری قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کردیا ہے جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے۔ کتنے قتل کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے خمر کہتے ہیں چھا جانے کو اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش پر چھا جائے وہ خمر میں داخل ہے حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے" آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔"[1] فرمایا "جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔"[2] آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا "اس اللہ کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو

---

۱ صحیح بخاری و مسلم کتاب الاشربہ۔

۲ ایضاً۔

جاتی۔‘‘ [۱] گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ’’کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔‘‘ [۲] یہ بھی فرمایا کہ ’’قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔ [۳]

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کئے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ [۴]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آ چکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ۔۱) گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا' بنانا' بیچنا' خریدنا' لینا' لے جانا' سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا ’’اللہ نے شراب پر' اس کے پینے والے' پلانے والے' خریدنے والے' دوسروں کے لیے نچوڑنے والے' اپنے لئے نچوڑنے والے' اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے' سب پر لعنت فرمائی ہے۔ [۵] یہ بھی ارشاد ہوا کہ ’’ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا بھی ویسا ہی حرام ہے۔‘‘ [۶]

---

۱ ایضاً۔

۲ ایضاً۔

۳ ایضاً۔

۴ ایضاً۔

۵ ابوداؤد کتاب الاشربہ۔

۶ صحیحین وابوداؤد وترمذی کتاب الاشربہ۔

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے۔

﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ (شوریٰ۔۴)

جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔" [1]

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہؓ بن قدامہ، حضرت ابو درداءؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کیا کرو"۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دو بارہ سہ بارہ عرض کی، آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ "غصہ نہ کیا کرو" [2] مسند احمد ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابو سعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا "آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے، اور سکون جلد ہو جاتا ہے، اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفعہ بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے، اور دور جلد ہو جائے، اور ان سب سے برا وہ جس کو غصہ جلد آتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو، ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے" [3]

ابو داؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی

---

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب یحذر من الغضب۔

[2] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی منذری باب الترہیب من الغضب۔

[3] جامع ترمذی منذری باب مذکور۔

ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرلے"[۱] حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو اسے چاہئے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے"[۲]

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا، مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہے۔[۳]

اس اخیر حدیث میں تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ؁ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ (اعراف۔۲۴)

معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی بات کہہ، اور نادانوں سے درگذر کر، اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسی قسم کی آیت سورۂ حم السجدہ (۵) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ ہے۔

"نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا، اور یہ بات ملتی ہے اسی کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے"

آنحضرت نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) اللہ اس کی سنے گا، اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرلے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو اللہ کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

۱۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کتم غیظاً۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔

بغض و کینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے' یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (حشر۔۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے' معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ' اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے' وہاں بغض و کینہ کا گزر نہ ہوگا' فرمایا۔

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ (حجر۔۴)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا' بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ﴾ (اعراف۔۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا' نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارے سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا' جنت کا تختہ ہاتھ نہ آئے گا۔

آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہئے فرمایا۔

''اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو' ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ' کسی بھائی کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے''۔[۱]

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے' ابوایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے' دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے' اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔'' [۲] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے' تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آکر ملے' پھر سلام کرے' تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی' اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا۔'' [۳] کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس

۱۔ صحیح بخاری و مسلم و مالک' ابوداؤد' ترمذی' نسائی۔
۲۔ مالک' بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد۔
۳۔ سنن ابوداؤد۔

نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں۔[۱] اس حدیث کی تشریح ایک اور روایت سے ہوتی ہے، فرمایا ''دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہو گی اس کو مغفرت دی جاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہو گی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہیں آئیں۔''[۲] یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشش نہیں، ان میں سے ایک وہ جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے۔[۳]

ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور انہیں دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

۱۔ مالک و مسلم ابوداؤد، ترمذی و ادب المفرد بخاری۔

۲۔ طبرانی فی الاوسط (منذری ص ۱۶۴ مصر۔

۳۔ ادب المفرد بخاری باب الشحنا۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے' یہاں تک کہ کفروشرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے' مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں' قرآن پاک میں اس کے لئے دو اور لفظ بغی (سرکشی) اور عدوان (تعدی) آئے ہیں' یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ﴾ (اعراف۔۴)

کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے' اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

﴿ وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ﴾ (نحل۔۱۳)

اور اللہ بے حیائی' ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے' جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے' اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے' اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے' تا کہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں' گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں' مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تا کہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے' فرمایا۔

﴿ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ (شوریٰ۔۴)

اور جن پر ظلم ہو وہ بدلہ لیتے ہیں' اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے' تو مظلوم اپنا انصاف اللہ کے ہاں پائے گا' اور ظالم اللہ کی محبت سے محروم رہے گا۔

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ (شوریٰ۔۴)

پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے' تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے' بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴾ (شوریٰ۔۴)

اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے۔

﴿ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ (شوریٰ۔۴)

راہ ان پر جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں ان کے لئے دکھ والی سزا ہے۔

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی۔

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا﴾ (اسرائیل۔۴)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے تا کہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہئے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ (نساء۔۲۱)

اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو اللہ کے قانون کے آگے سرنگوں کریں۔

﴿ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (حجرات۔۱)

تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آوے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہئے فرمایا:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (مائدہ۔۱)

اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا مؤثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کو اپریشن ہے اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے

ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا "اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔" [۱] اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے، تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی، فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمھارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔" [۲]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔" [۳] ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہو گی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔" [۴] براءؓ بن عازب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا، اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ [۵] حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا، تو ان کو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔" [۶] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے، اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہو گا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی، اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔" [۱]

---

۱ صحیح بخاری ابواب المظالم وصحیح مسلم باب نصر الاخ ظالماً ومظلوماً۔

۲ صحیح مسلم باب تحریم الظلم، وترمذی کتاب الزہد، ومسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۵۴ وصفحہ ۱۶۰ وصفحہ ۱۷۷ وادب المفرد بخاری باب الظلم۔

۳ صحیح مسلم باب تحریم الظلم وصحیح بخاری ابواب المظالم۔

۴ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

۵ ایضاً۔

۶ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فرمایا کہ "ظالم کو اللہ مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔" ؎۲

فرمایا اہل ایمان جب دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کئے تھے، ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔ ؎۳

❁❁❁

۱؎ ایضاً۔
۲؎ صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔
۳؎ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے، یا کم پایا جاتا ہے اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدمؑ کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا

﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ (اعراف۔۲)

میں اس سے بہتر ہوں۔

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا:

﴿فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴾ (اعراف۔۲)

یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں، اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا ''نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے، اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔'' [1]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا۔ پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ابراہیم۔۳)

اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے، تو کیا (آج) تم عذاب اللہ میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ﴾ (مومنون۔۳)

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

تو وہ سب شیخی میں آ گئے' اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے' ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں ' اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔

﴿ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴾ (ھود۔۳)

اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے' لگے کہنے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو' اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمھارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذیل ہیں' (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے' بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی' قومی' سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے تا کہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں' عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں' بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

﴿ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ﴾ (ص۔۱)

لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے) ہیں۔

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ (مومن۔۴)

جتنے مغرور اور سرکش ہیں' اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لئے مختال کا لفظ آیا ہے' یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴾ (نساء۔۶)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ (نحل۔۳)

اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہیں دے دی گئی ہے۔

﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ (زمر۔۶)

کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔

﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ (زمر۔۸)

تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر وغرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات ونتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1] اور امام غزالیؒ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ”مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا“۔ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بداخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لئے ان سب کا استقصاء تو مشکل تھا البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیئے ہیں، مثلاً کبر وغرور کے جو مظاہر امراء وسلاطین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے“۔ ایک بار آپ ﷺ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے، فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو۔[2]

بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر وغرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے آپ کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”سب سے برا نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔“[3]

کبر وغرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً

﴿ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا، اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (لقمان۔۲)

---

1. ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔
2. ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔
3. صحیح بخاری۔

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل' بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو فخار ہو۔

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے:

﴿ ثَانِيَ عِطْفِهِ ﴾ (حج۔۱)

اینٹھتا ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [۱]

جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا' اللہ اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو اللہ نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے' [۲] اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں' اور ان ہی کو اللہ نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے۔

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (فرقان۔۶)

اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے' ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا' اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے' فرمایا ''اللہ نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے' متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے''۔ [۳]

ایک صحابیؓ نے جن کو لوگ مغرور سمجھتے تھے' اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں' حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں' کمبل اوڑھتا ہوں' اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں' اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔ [۴]

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں' لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں' حسب و نسب' حسن و جمال' مال و دولت' قوت اور اعوان و انصار کی کثرت' اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا' اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (حجرات۔۲)

لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا' اور (پھر) تمھاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔

---

۱ ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔

۲ ترمذی ابواب الزہد۔

۳ ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ باب الاکل متکئا۔

۴ ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر۔

اس کے بعد بتایا کہ شرافت وعظمت کی بنیاد نسب وحسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے۔

﴿ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (حجرات۔۲)

اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ" خداوند تعالیٰ نے تمھارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا' اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں' مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت' تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے'لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا اللہ کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹا چلتا ہے۔"[۱]

جہاں تک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے' حسن وجمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا' چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو' تو فرمایا کہ "اللہ حسن کو پسند کرتا ہے۔"[۲] یعنی اس کا نام غرور نہیں' البتہ جن صورتوں میں حسن وجمال' غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے' شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے' چنانچہ ایک صحابیؓ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے' اور اللہ غرور کو نہیں پسند کرتا۔[۳]

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال ودولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال ودولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا' لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر وغرور کا ذریعہ بنا لیا جائے' تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں۔

﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ (حدید۔۳)

((لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا (بس یہی کچھ ہے)

احادیث میں مال ودولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے' ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر وغرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے' حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں' ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو مال ودولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا۔

آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال' حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا' کھا لی

---

۱ ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر۔

۲ ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔

۳ ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔[1]

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جا سکتے ہیں اس لئے اس قسم کے موقعوں پر ایک قابل ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کو "قوی امین" کہا ہے اور حضرت لوطؑ نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے۔

﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ﴾ (ھود۔۷)

(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے۔

﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً﴾ (روم۔۶)

اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا پھر (بچپن کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ ط اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ﴾ (انفال۔۸)

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[2] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابل ستائش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

﴿الا اخبر کم باھل الجنة کل ضعیف متضعف الا اخبر کم باھل النار کل عتل جواظ متکبر﴾[1]

کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ بدخو اور مغرور شخص۔

دوسری حدیث میں ہے:

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

[2] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز۔

﴿ احتجت النار و الجنة فقالت هذه يدخلني الجبارون المتكبرون وقالت هذه يدخلني الضعفاء و المساكين ﴾[2]

دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا' دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے' اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے' بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرت مال اور کثرت اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں' بلکہ اللہ کو بھلا دیتی ہیں' زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی' وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے۔

﴿ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴾ (کہف۔۵)

میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لئے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں۔

﴿ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا ﴾ (کھف۔۵)

کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے' جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں' اہل عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے' اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ ''تکاثر'' ایجاد ہو گیا تھا جس نے ان کو دینی امور سے غافل وبے پروا کر دیا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسان کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی۔

﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ (تکاثر۔۱)

تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے' یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں' بلکہ اجتماعی وتمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے' بشرطیکہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے' اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے

---

۱ بخاری کتاب الادب باب الکبر۔

۲ مسلم کتاب صفات المنافقین واحکامھم باب النار یدخلھا الجبارون۔

۳ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار۔

ارشاد فرمایا ہے۔

﴿تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم﴾ [1]

محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو کیونکہ کثرت تعداد میں میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

[1] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ۔

ریاء

ریاء کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں‘ انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے اس لئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے‘ صحیح حدیثوں میں ہے کہ

﴿اِنّمَا الاعمالُ بالنّیات﴾

عمل نیت سے ہے۔

اور ریاء اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے‘ غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے‘ کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں‘ اسی لئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے‘ جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو‘ بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو‘ فرمایا۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ﴾ (انفال۔۶)

اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو‘ جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ ریاء اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے‘ جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے‘ بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرک خفی اور شرک اصغر رکھا ہے‘ کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں اللہ کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے‘ اسی لئے اللہ فرماتا ہے:

﴿اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ﴾ (فرقان۔۴)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اللہ بنالیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں وہ اسی کے لئے ہے‘ جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔“

ایک صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو اللہ کے لئے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے‘ وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے‘ کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف

ہے' لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند' سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے' بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔'' [1]

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے' نفاق کیا ہے؟ نفاق یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریاء اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے' وہ دل سے اللہ کا منکر ہوتا ہے' لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے' اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے' اس بنا پر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (بقرہ۔۳۶)

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں' ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا' دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے' اس لئے وہ نہایت بے پروائی' غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں' اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع' للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں' اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے' تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں' اسی لئے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا۔

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (نساء۔۲۱)

منافق (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں' حالانکہ (حقیقت میں) اللہ ان ہی کو دھوکے میں رکھتا ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں (ظاہرداری کرکے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے' مگر کچھ یوں ہی سا۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴾ (ماعون)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے' جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں' اور جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔

---

[1] ابن ماجہ باب الریا والسمعہ۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ نکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمھارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟" صحابہ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرک خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے' اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔" [1]

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا' چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریا کاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں' رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی' مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے' جو عام طور پر نیک نامی' شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے' بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے' اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا' اس لئے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی تا کہ اس میں ریا کاری کی آمیزش نہ ہونے پائے۔

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (بقرہ۔ ۳۷)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مند کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا' اللہ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا' جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔ [2]

عرب کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہار شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا' اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں' اس لئے وہ ریا کاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا' لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی۔ چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے' ایک شخص دولت کے لئے' اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے' تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے' فرمایا "اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔"

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے' ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریاء سے جہاد کرتا ہے' تو کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے' وہی پہلا جواب ملا۔ [3]

---

[1] بخاری کتاب الزکوۃ باب الصدقۃ بالیمین۔

[2] مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فہو فی سبیل اللہ۔

[3] مسلم کتاب الامارۃ۔

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی' اس لئے اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہوسکتی تھی' اس کے نتائج بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت موثر طریقے سے بتائے ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی' یہ شخص اللہ کے سامنے لایا جائے گا اور اللہ اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا' اللہ کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے' اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا' پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا' لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔

اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا' علم سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا' ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ' قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ' پھر اسی طرح وہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا' اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا' وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے' میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا' ارشاد ہوگا جھوٹ بکتے ہو' تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں' پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

❁❁❁

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی، خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہیں، اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے، اللہ کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لئے اور شکست فتح سے بدل گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا ﴾ (توبہ۔۴)

اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی، تو اس کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔

اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو۔

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ ﴾ (انفال۔۶)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا۔

﴿ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ﴾ (قصص۔۶)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں جب وہ اپنے گذران میں اترا کر چلیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی، تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی

چاہئے۔[1]

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عجب وخود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے۔

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ (نجم۔۲)

تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو، پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود ونصاریٰ میں عجب وخود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (مائدہ۔۳)

اور یہود ونصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ (جمعہ۱)

(اے پیغمبران یہودیوں سے) کہو کہ اے یہودا گر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے چہیتے ہو۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب وخود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا"۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔"[2] مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب وخود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا علاج سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا

﴿لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ (حدید۔۳)

اللہ نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح۔

[2] ابوداؤد۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے' چونکہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی' اس لئے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے' کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا' نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے' نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے' جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے' جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں' شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے' یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا' اس کو **معاقرہ** کہتے تھے' آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔[1]

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی' اسی کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے' پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا' تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے' اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا۔

﴿ وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے' امام غزالیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

"بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے' کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے' پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے"

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں' وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے' یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے' کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر

[1] ابوداؤد۔

کسی کام کے نہیں رہو گے' بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائیں گے۔

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل۔۳)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔

کیونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان۔۶)

اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی پسند کرتا ہے اور کھانے' پینے' پہننے اور اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے' بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے' مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے' سورۂ اعراف میں اللہ فرماتا ہے۔

﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (اعراف۔۳)

اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو' بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں' مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (انعام۔۱۷)

درخت کے پھل سے جب وہ پھل تم کھاؤ' اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو' اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم وفضل، مال ودولت، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک ومنافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بد اخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اللہ کی نعمتیں اس سے چھین لی جائیں، تو اسی کا نام حسد ہے، اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن وایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے۔

﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء۔۸)

یا اللہ نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔

اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے۔

﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ (بقرہ۔۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

حسد کی تین قسمیں ہیں

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان کی طرح کافر ہو جائیں۔

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ (نساء۔۱۲)

ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جائیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھن جائے، اس کو مل نہیں سکتی، اس لئے بالغرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسروں سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے۔

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النساء۔۵)

اور اللہ نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے اس لئے یہ بھی مذموم ہے البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں اسی لئے فرمایا:

﴿وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (نساء۔۵)

اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں حسد کے سات اسباب ہیں۔

(۱) بغض و عداوت کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اس کی بجائے اللہ اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِىْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ (آل عمران۔۱۲)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ (آل عمران۔۱۲)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے اس لئے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے۔

﴿اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ (انعام۔۶)

کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں کفار اسی وجہ سے

پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے۔

﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنواسرائیل۔۱۱)

کیا اللہ نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا ایک مقصد ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا۔

﴿اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ (یوسف۔۲)

جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجود یہ کہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانہ روزگار ہونا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہو گیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا، اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے، منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔ [۱]

(۷) حسد کا ساتواں سبب خبث نفس اور بدطینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بیگانوں میں جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم رابطہ و اشتراک ہوتا ہے۔

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا کسی عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لئے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس

---

[۱] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین۔

وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے اس لئے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

﴿ ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا (بخاری کتاب الادب باب ما نُہی عن التحاسد والتدابر)

بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو بلکہ اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿ المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقة والرحمة والمحبة والمواساة والمعاونة والنصیحة ﴾

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کے تمام محاسن اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

﴿ کانہ قال اذا ترکتم ھذہ المنہیات کنتم اخوانا و مفھومہ اذا لم تترکوھا تصیروا اعداء و معنی کونوا اخوانا اکتسبوا ما تصیرون بہ اخوانا مما سبق ذکرہ وغیر ذلک من الامور المقتضیة لذلک نفیا و اثباتا۔ ﴾ (فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۰۳)

گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا ''شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو، اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو، اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ''[1] لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا، اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا

[1] مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۰۳ مصر۔

﴿ ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب ﴾[1]

تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴾ (فلق)

اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

[1] ابوداؤد، کتاب الادب فی الحسد۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں' ایک قسم تو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند' بے باک' نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں' مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کئے جاتے ہیں' جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں' اور قرآن مجید کی اس آیت میں۔

﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اس کی ممانعت کی گئی ہے' لیکن حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے' اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں' حالانکہ یہ زمانہ ذکر الٰہی کا ہوتا ہے' ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں' بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک مجمع میں خطبہ دیا'[1] اور حمد وثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم میں کوئی آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح اللہ کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟'' لوگوں نے کہا ''ہاں'' پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا' میں نے یہ کیا''۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے' پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟'' اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ''ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں'' فرمایا ''تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی' حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔''[2]

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے' اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے' ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھودیں گی' اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کردے گا' یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز واستعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے' تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے' چنانچہ قرآن مجید اس قسم کے واقعات مجاز واستعارہ ہی کے پردہ میں بیان کئے گئے ہیں' مثلاً:

﴿ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾ (نساء۔۳)

۱؎ دونوں کی نشستیں الگ تھیں ''س''۔

۲؎ ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل۔

حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی باہم صحبت ہو چکے)

﴿ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ ﴾ (نساء۔۷)

یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ شرمیلا اور شریف ہے اسی لئے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہیں جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہئے پائخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں ''قضائے حاجت'' کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ ﴾ (نساء۔۷)

یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لئے استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائیں خانہ ہے چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں اس لئے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوء کے لفظ سے کی ہے جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں۔

﴿ وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ﴾ (طہ۔۱)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک عام لفظ ''فسق'' سے اس کی ممانعت کی ہے۔

﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ﴾ (بقرہ۔۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ فسق کی نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس

کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

﴿ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (نساء۔۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظلم کو برملا بیان کرسکتا ہے)

قرآن وحدیث میں جا بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی نکالتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام۔۱۳)

اور (مسلمانو!) اللہ کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر اللہ کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ پر لعنت بھیجے، کہا گیا کہ یا رسول اللہ کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا ''اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس کے باپ ماں دونوں کو برا بھلا کہے گا۔''[۱]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے''۔ لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف ومحبت کے ساتھ ملے، فرمایا ''عائشہؓ تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔''[۲]

(۳) بدزبانی دور وحشت وجہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔[۳] امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق وملاطفت اور شرم وحیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے، لیکن بدزبانی

---

۱ بخاری کتاب الادب باب لایسب الرجل والدیہ۔

۲ بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا۔

۳ بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن۔

ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السّام علیکم، تم کو موت آئے، کہا۔ حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا عَلَیْکُمُ وَلَعَنَکُمُ اللّٰہُ وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔ تم کو موت آئے، اللہ تم پر لعنت بھیجے، اور تم پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "اے عائشہؓ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔[1]

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا: ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔"[2] اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

(۶) گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں،[3] مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔[4]

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿سباب المسلم فسوق وقتاله كفر﴾[5]

مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ليس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی﴾[6]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفحشا۔
[2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الفحش۔
[3] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل۔
[4] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الشتم۔
[5] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن۔
[6] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ۔

جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔[1]

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص حوادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مشیت الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ "اللہ کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔"[2] یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود اللہ کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف اللہ کی فرمانبردار ہے۔"[3]

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا،[4] اور یہ اس عورت کی سزا تھی تا کہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔[5]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا،[6] بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اللہ نے تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمھارا یہ دن، تمھارے اس مہینہ اور تمھارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

1. بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔
2. بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدہر۔
3. ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن۔
4. ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ۔
5. بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن، ومسلم کتاب الایمان۔
6. فتح الباری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے' ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے' جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے' مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں' اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ ور ہیں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے' اس لئے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے' بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عادات ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے' اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو۔ جھوٹ' غیبت' خلاف وعدگی' اتہام' بدگمانی' خوشامد' چغل خوری' دورخاپن' جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی برائی حب مال ہے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے' بخالت' حرص و طمع' چوری' غصب' خیانت' غلول' ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسری اساسی برائی حب ذات ہے' اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد' تکبر' عجب' فخاری' غیظ و غضب' ظلم' کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں' جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا۔

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ (نازعات۔۲)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا' تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزء ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی و لطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماع اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلامؐ نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا۔ لیکن اسلام میں جو مذہب کا سر چشمہ ہے وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے اس لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا۔[1] ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی ستر عورت، اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کی تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات

[1] ترمذی ابواب النکاح۔

کے بیان کے مطابق یہ اللہ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔ [1]

حضرت ابراہیمؑ انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں‘ ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں‘ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصال فطرت کہتے ہیں‘ امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا‘ مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے‘ ایک حدیث میں ہے: ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں‘ ختنہ کرانا‘ موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا‘ [2] ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں‘ مونچھ ترشوانا‘ داڑھی بڑھانا‘ مسواک کرنا‘ ناک میں پانی ڈالنا‘ ناخن ترشوانا‘ انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا‘ بغل کے بال صاف کرنا‘ موئے زیر ناف کو صاف کرنا‘ پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا‘ غالباً کلی کرنی ہوگی۔ [3]

فطرت کے آداب یہ اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں‘ چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا‘ ناک میں پانی ڈالنا‘ اور کلی کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا‘ بال بنوانا‘ مونچھیں ترشوانا صفائی کے ضروری لوازم ہیں‘ جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں‘ وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں‘ جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے‘ یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا‘ اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے‘ مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے‘ مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے‘ بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی اشعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔“ [4] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ“ [5] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم رواج کا واہمہ ہے‘ جس رنگ کی عینک لگائے‘ دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

---

[1] توراۃ پیدائش۔

[2] تورات پیدائش۔

[3] صحیح مسلم باب خصال الفطرہ۔

[4] ایضاً۔

[5] صحیح مسلم خصال الفطرہ۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب وشائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔گوکہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی بہت کم تھا پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔زن وشوہر کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کرلیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہوسکتی۔فرمایا۔

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ﴾ (مائدہ۔۲)

اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں،فرمایا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (مدثر۔۱)

اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمّم کرنا چاہئے۔

﴿ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ﴾ (مائدہ۔۲)

تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ' منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیرلیں،اس کا نام وضو ہے۔

﴿ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ (مائدہ۔۲)

جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔فرمایا۔

﴿ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۸)

اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا" جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں

ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے۔کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے"۔[۱] اس حدیث سے معلوم ہو کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے۔سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔[۲]

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے۔اس لئے خیال رکھنا چاہئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

(۲) دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے ضروری بتلائی' مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔[۳] ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا کہ تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں،مسواک کیا کرو۔(مسند احمد ج اصفحہ ۲۱۴)

(۳) عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہئے۔[۴] یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

(۴) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہئے بلکہ مجنب کو چاہئے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے۔کیوں کہ ہماری تھوڑی سی سہل انکاری سے وہ پانی دوسروں کے لئے ناپاک یا قابل کراہت' بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا۔

(۵) عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے۔اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

(۶) پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے کیوں کہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

(۷) غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

(۸) بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے۔ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو

---

[۱] مسلم کتاب الطہارۃ۔

[۲] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

[۳] ایضاً۔

[۴] ایضاً۔

لینا اچھا ہے۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

(۹) طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے۔ ۱؎

(۱۰) ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔ بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی رسول اللہؐ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے۔ ۲؎ جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ ۳؎

(۱۱) جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہئے۔ چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا۔ ۴؎

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔ اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہودیوں کے مذہب کے رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدت احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ۵؎

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے

۱؎ یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھئے۔

۲؎ ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

۳؎ مسلم کتاب الصلوۃ۔

۴؎ ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب۔

۵؎ صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین۔

تھے اوراس کوگھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ ﴾ (بقرہ-۲۸)

اور (اے پیغمبر! لوگ) تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہولیں ان سے مقاربت نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کردیں۔چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ایک بار آپ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔[1]

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جاسکتے،قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔اسی اصول کی بناپر بعض صحابہؓ نے حالت جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا۔لیکن آپ نے فرمایا کہ''مسلمان نجس نہیں ہوتا''۔[2] یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔[3] یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے۔جب بارش ہو تو ہم کیا کریں۔فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں''ہاں'' ہے۔فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کرسکتی ہے۔اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لئے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا[4]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا۔

[2] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

[3] ایضاً۔

[4] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لئے جائیں پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے پھر وضو کرتے۔ لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہا لے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا [۱] نہیں اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ [۲] ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

(۲) مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہونا چاہئے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقاء اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔ یہ کام اللہ کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینی چاہئے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے [۳] اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے۔ [۴]

(۳) انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لئے خاص کر دیئے جائیں۔ چنانچہ سب اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔ اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے۔ انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر کاموں کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے۔ یعنی ''دایاں پہلو'' تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ سب انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے۔ [۵] صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ

---

۱ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

۲ ایضاً۔

۳ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

۴ ایضاً۔

۵ ابوداؤد کتاب الاطعمہ

شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے۔آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔[1]

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔آپ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔اس نے کہا میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا۔[2]

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں کھانا چاہئے کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔[3]

(۵) اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہئے[4] کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تا کہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے۔یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دلیل ہے۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہئے۔

(۶) کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیوں کہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے۔اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہئے ورنہ چھوڑ دینا چاہئے۔[5]

(۷) سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے۔اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست واحباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی۔[6] لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

[2] ایضاً۔

[3] ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام۔

[4] سنن ترمذی ابواب الطعام۔

[5] بخاری کتاب الاطعمہ۔

[6] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

کہ برکت ہوتی ہے۔ اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو۔ صحابہؓ نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کرلو تو برکت ہوگی۔[1]

(۸) کھانا ٹیک لگا کر بیٹھ کر یا منہ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہئے۔[2] کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے لئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی طرح پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دو زانو بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر۔[3] آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔[4]

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے۔[5] خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لئے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

(۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہئے۔

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہئے۔[6] اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

(۱۲) پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہئے کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے۔ اس لئے اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہئے۔

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہئے کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔[1]

---

۱ ایضاً۔

۲ ایضاً۔

۳ ابوداؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادۃ فیروز آبادی للشیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی۔

۴ ابوداؤد و ابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج ۴ ص ۳۹۸۔

۵ بخاری کتاب الاطعمہ۔

۶ بخاری کتاب الاشربہ۔

مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔البتہ زمزم کا پانی برکت، دعاء اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہوکر پینا مسنون ہے۔

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہئے۔کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہئے [۲] تا کہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

(۱۶) کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں۔جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ [۳]

---

[۱] ابوداؤد کتاب الاشربہ۔

[۲] ایضاً موطا امام محمد۔

[۳] صحیح مسلم کتاب الاشربہ۔

آداب مجلس

آداب مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہوتا کہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

(۱) مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کی آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہئے یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔کیوں کہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔[۱] انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔اسی لئے **تخطی رقاب** یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے۔[۲] اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق [۳] ہے دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔کیوں کہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

(۴) اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔[۴] کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے۔اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے [۵] کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا

---

۱ ادب المفرد باب یجلس الرجل حیث انتہی۔

۲ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیتان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ۔

۳ ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ۔

۴ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما۔

۵ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقہ۔

اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تا کہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

(۶) مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے۔[۱] کیوں کہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈنڈا شرک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص گویا اللہ بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۷) راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آنے والے کو تکنا بداخلاقی ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔[۲]

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے، ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔[۳] ایک مشہور مثل ہے کہ ''اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ''۔ اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔[۴]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی ازخود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔''

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور

---

۱ ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔

۲ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات۔

۳ ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ۔

۴ بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک۔

دوسروں کے لئے جگہ بنانے کے لئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو خود سکھایا۔فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ (مجادلہ۔۲)

اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو۔اللہ تمہارے لئے کشادگی کرے گا۔اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔منافقوں کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے۔

﴿ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ (مجادلہ۔۲)

یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔اسی لئے ارشاد ہوا کہ ''تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا''۔[۱]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہئے کہ المجالس بالامانة قول نبوی ہے[۲]

❀❀❀

---

۱ ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث۔

۲ ایضاً۔

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنالیا۔[1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے۔اسی لئے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے''۔[2] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللّٰہُ بکَ عینا ۔ و انعم اللہ بك صباحًا کہتے تھے۔یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔تمہاری صبح خوشگوار ہو۔امراء وسلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے ایرانی ہزار سال بزی ہزار برس جیو کا فقرہ کہتے تھے۔یورپ کے لوگوں میں صبح کو ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔مگر اسلام نے سب کے بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں:

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیا علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں وَالسَّلَامُ عَلَیَّ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اس کی صورت ذکر و دعاء کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

(۳) اس میں مذہبی شان پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

(۴) اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کیا کریں تو آپؐ نے

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان۔

[2] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

ان کو اس کی اجازت نہیں دی [1] ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے' فرمایا ''نہیں'' اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا ''نہیں'' [2] اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے' فرمایا ''ہاں''۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال' آل واولاد' دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی پر مشتمل ہے۔

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے' اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے' اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۷) اسلام نے اپنے پیرووں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے' آمنے سامنے جب یہ دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں' یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی

﴿ یایها الناس افشوا السلام، واطعموا الطعام، وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام ﴾ [3]

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ' کھانا کھلاؤ' اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو' یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرما دی اور فرمایا کہ ''تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ' اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو' میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔ [4]

سلام کرنے کے لئے شناسا و غیر شناسا' جانے اور انجان کی تخصیص نہیں۔ [5] مرد اور عورت کی تفریق نہیں [6] بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں [7] البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے' جو تمام متمدن قوموں میں

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المراۃ۔

[2] یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو۔

[3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔

[4] ترمذی ابواب الزہد ص ۴۰۹۔

[5] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام، بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ۔

[6] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال۔

[7] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان۔

رائج تھے' ایک یہ کہ چھوٹا ادب واحترام کا لحاظ کرے' اور اس اصول کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو' گذرنے والا بیٹھنے والے کو' اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے' دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو' اس اصول کی بناء پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہئے۔[1]

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔[2] مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔[3] سلام میں رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے' چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اور کہا ''السلام علیکم'' آپ نے فرمایا ''اس کو دس نیکیاں ملیں''۔ دوسرا آدمی آیا تو کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ نے فرمایا ''اس کو بیس نیکیاں ملیں''۔ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ'' آپ نے فرمایا ''اس کو تمیں نیکیاں ملیں۔''[4]

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے' یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے ورنہ کم ازکم وہی الفاظ دہرادے' چنانچہ خود فرمایا قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:

﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ (نساء۔۱۱)

اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے' لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے۔

(۲) ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے' اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے' اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے'[5] مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے'[6] اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کرلیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے' لیکن اگر شرعی مجبوری نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے' چنانچہ ایک بار حضرت زید

---

۱ کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی۔

۲ ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔

۳ ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود۔

۴ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماذکر فی فضل السلام۔

۵ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔

۶ ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ۔

بن حارثہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے سے لگا لیا' اور ان کا بوسہ لیا۔[۱]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوش محبت اور جوش عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں' حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے' ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں' ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے' آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔[۲]

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے' اسلام نے ان کو ایک قلم منسوخ کر دیا' ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے' آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔[۳]

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔[۴]

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر میں جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے۔

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ (نور۔۴)

مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو' یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہ جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ' یہ (لوٹ آنا) تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے' اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لئے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔[۵]

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں' لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے'

---

۱ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلہ

۲ یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام میں ہیں

۳ ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل

۴ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا

۵ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجھن

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[1] اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے [2] تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ ﷺ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے، [3] ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔ [4] ایک بار کسی نے آپ ﷺ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمھاری آنکھوں میں کونچ دیتا، پھر فرمایا

﴿انما جعل الاذن من قبل البصر﴾ یا فرمایا ﴿انما جعل الاستیذان من اجل البصر﴾
یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں [5]

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ [6] تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے، [7] البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، [8] اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، [9] دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، [10] خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئیں ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لئے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام، اس لئے اگر ان کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان

---

1. ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی عورات الثلاث
2. ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب
3. ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان
4. ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا اعینہ فلا دیۃ لہ
5. اس کتاب کے صفحہ ۸۸ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں انما الاذن لاجل الرویۃ مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان، باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم۔
6. ابوداؤد کتاب الادب باب فی استیذان
7. ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان
8. ادب المفرد باب دعاء الرجل اذنہ
9. ادب المفرد باب مالا یستاذن فیہ
10. ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق

کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے‘ اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعین کر دی ہے‘ یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے‘ اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لئے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے‘ فرمایا

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (نور۔۸)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں‘ (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لئے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو‘ اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں‘ ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے) کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے‘ (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے‘ اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہیں اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہئے۔

آداب گفتگو

آداب گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو۔

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طہ-۲)

تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو‘ فائدہ مند ہو اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو‘ اسی لئے فرمایا:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقرہ-۱۰)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔ یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے انظرنا (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ راعنا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا‘ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا‘ فرمایا۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ (بقرہ-۱۳)

اے ایمان والو! راعنا نہ کہو‘ انظرنا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورہ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں‘ اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو‘ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (احزاب-۹)

اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ کرو‘ اور بات سیدھی کہو‘ اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو‘ فرمایا۔

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (احزاب-۴)

تو (اے نبی کی بیویو) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو‘ ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ اللہ جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کر لے گا‘ اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔

مردوں کو نرم‘ معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے‘ فرمایا:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ﴾ (بقرہ۔۳۶)
نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔
بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ‘ بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے‘ فرمایا:
﴿ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾ (لقمان۔۲)
اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔
فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے‘ مسلمانوں کی صفت یہ ہے۔
﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)
اور جو لغو سے اعراض کرتے ہیں۔
کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے‘ اس پر اللہ کا فرشتہ گواہ رہتا ہے‘ اللہ فرماتا ہے۔
﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (ق۔۲)
آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا‘ لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔
اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔“ [1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں‘ کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے‘ ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔“ [2] یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے‘ مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لئے ملی ہے‘ اسی لئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں‘ پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں‘ اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔
﴿ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ﴾ (فرقان۔۲)
اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔

گفتگو بضرورت کرنی چاہئے‘ احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہیں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں‘ اور فرمایا کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں‘ [3] یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو

[1] کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف۔
[2] موطا و شرحہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد۔
[3] ادب المفرد باب فضول الکلام۔

اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[۱] یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا، وہ جنت میں جائے گا۔[۲]

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے (ابو داؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث) اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا، [۳] حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:

﴿کان کلام رسول الله ﷺ کلا ما فصلا یفهمه کل من سمعه﴾ [۴]

رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔[۵]

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے[۶] بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع، مقفٰی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''اللہ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے''۔ نیز فرمایا کہ ''جو شخص اسلوب کلام میں اس لئے ادل بدل کرتا ہے کہ

---

۱ موطا امام مالک باب یومر بہ من التحفظ فی الکلام۔
۲ موطا امام مالک باب ماجاء فی ما یخاف من اللسان۔
۳ ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث۔
۴ ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔
۵ ابوداؤد کتاب الادب باب الهدی فی الکلام۔
۶ یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔

اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے' اللہ قیامت کے دن اس کا فدیہ وتوبہ نہ قبول کرے گا۔''[1]

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے' بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے' تا کہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔[2]

❁ ❁ ❁

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام۔

[2] ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لایقبل علی واحد۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے، اللہ اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (فرقان۔۶)

اور رحمت والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور اور تکبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل۔۴)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان۔۲)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا چھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لئے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا۔

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ﴾ (نور۔۴)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے تا کہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں۔ پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾ (احزاب۔۸)

اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکا لیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں،[۱] تو کوئی نہ ستائے۔

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ﴾ (نور۔۴)

---

۱ یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔

اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں' اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں' مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے' اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں' اور اپنا سنگار نہ دکھائیں' لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو۔

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے' کیونکہ اس سے میلان طبع پیدا ہوتا ہے' اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں' اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافت نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہئے' اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے' عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا' اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔ [1]

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہئے' یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہئے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو' بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔ [2]

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائیں' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو' یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔ [3]

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہئے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ [4] کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے' ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔ [5]

❁❁❁

---

۱ ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔

۲ صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوۃ بوقار۔

۳ ابوداؤد باب الانتعال۔

۴ ایضاً۔

۵ ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

آداب سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا' اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے' اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین' عرب کی آب وہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت ومطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک' بنجر اور پتھریلی' پانی کی قلت' ہوا کی گرمی' دھوپ کی تمازت' قتل وغارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ' ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں' جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں' تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے' اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ [۱]

﴿ اَسۡتَوۡدَعَ اللّٰهَ دِیۡنَكُمۡ وَاَمَانَتَكُمۡ وَخَوَاتِیۡمَ اَعۡمَالِكُمۡ ﴾

یعنی تمہارے دین' امانت' اور خاتمہ عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے' [۲] اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا' بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہئے' بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔ [۳] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسباب سفر کی حفاظت ونگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہئے۔ [۴] اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہئے' بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہئے۔ [۵]

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ [۶]

---

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء الوداع۔

[۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر۔

[۳] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسار وحدہ۔

[۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدہم۔

[۵] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔

[۶] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

(۷) سفر رات کو کرنا چاہئے' حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے' ۱؎ اور درحقیقت لو' گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے' بہر حال عرب کی سر زمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے' صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے' کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ ۲؎

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہئے' کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔ ۳؎

۱؎ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر۔

۲؎ مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔

۳؎ مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب۔

آداب خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ (روم۔۳)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تمھارا رات کو سونا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴾ (فرقان۔۵)

اور اسی نے تمھارے لئے رات کو پردہ، نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورہ نبا میں ہے

﴿ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ○ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ○ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴾ (نبا۔ا)

اور ہم نے نیند کو تمھارے لئے آرام، اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لئے ہے۔ یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور ع ۸ میں ہے۔

﴿ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ ﴾

اور رات آرام میں گذاری جائے، اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں اللہ کی یاد کی جائے۔

جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[۱] یہ تو عام افراد کے لئے ہے، لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴾ (ذاریات۔ا)

یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

(۱) سنت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے۔[۲] یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں اللہ کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لئے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت

۱؎ بخاری کتاب النکاح۔

۲؎ ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء۔

ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔[1]

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے' پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔[2]

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو۔[3] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

(۴) پاکی کی حالت میں سونا چاہیے' بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔[4]

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہئے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں۔[5]

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے۔[6] کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہہ بند باندھتے ہیں اس لئے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے' البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔[7]

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے' چراغ کو بجھا دینا چاہیے' کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو لے جاتے ہیں جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آگ تمھاری دشمن ہے' جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔[8]

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے' سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

﴿ اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَحْيٰى وَاَمُوْتُ ﴾

اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔

اور جاگے تو کہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴾

اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

---

۱ صحیح مسلم باب اکرام الضیف۔
۲ ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم۔
۳ ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر۔
۴ ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ۔
۵ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ۔
۶ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ فی ذلک۔
۷ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیا۔
۸ بخاری کتاب الاستیذان باب لاتترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل' مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

آداب لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں' ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے' اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزء ٹھہرایا' یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں سے گٹوں تک اور لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے'[۱] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں' یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو' فرمایا: اللہ تو دیکھتا ہے' اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے'[۲] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' کبھی ننگے نہ ہو' کیونکہ تمھارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں' جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں' تو ان سے شرم کرو' اور ان کا لحاظ رکھو۔[۳]

حضرت آدمؑ اور حواؑ کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے' اللہ کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔

﴿ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ﴾

(اعراف۔۲)

تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا' ان کے ستر ان پر کھل گئے' تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے' مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی' جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں' عرب میں بھی یہی حال تھا' بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے'[۴] ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ سبق دیا۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾

(اعراف۔۳)

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم۔

[۲] عورت کا چہرہ' قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔

[۳] سنن ترمذی ابواب الاستیذان والاداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ۔

[۴] ایضاً باب ماجاء فی الاستتار۔

اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمھاری ستر اور زینت کا سامان اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾(اعراف۔۴)

اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ﴾(اعراف۔۴)

کہہ دے! کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے منع کیا ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (اعراف۔۴)

کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ ستر پوشی ہے۔ ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے۔

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ (اعراف۔۳)

اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالحہ یا شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے۔ مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں، [۱] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیز گاری کا لباس مراد ہے یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشاء ہے، اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں ''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے، اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت باریک نہ پہنے، کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔ [۲]

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہئے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔

---

۱ صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

۲ روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تا کہ لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

۲۔ مردوں کے لئے عورتوں کی سی پوشاک، اور عورتوں کے لئے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنا لباس فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا، اسی لئے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے، فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا، البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں۔ خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ، یا صوفیوں کا گیروا رنگ۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشاء اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔''

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ نے فرمایا: اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کچھ کھولنا حلال نہیں۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں، آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے۔ البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لئے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیب سر فرمایا ہے۔

۸۔ مردوں کے لئے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے۔

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعاء پڑھا کرتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے' یہ دعاء پڑھتے تھے۔ [1]

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَقُوَّةٍ ﴾

اس اللہ کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا' اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)

❁❁❁

آداب مسرت

---

[1] تفسیر اعراف آیت مذکور۔

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہار مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴾ (قصص۔۸)

جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے۔

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ٥ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴾ (ھود۔۲)

اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید، ناشکر ہوا، اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔

اور اس کی ممانعت کی ہے۔

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (حدید۔۳)

اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجالانا چاہئے، تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ جارہے تھے، جب غروراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے اللہ سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے قبول کر لی، اس لئے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لئے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی، اس لئے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔ [1]

صحابہ کرام کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ [۲]

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے' اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں' چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا' [۳] اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شامل تھے۔ [۴]

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

﴿ فصل مابین الحلال و الحرام الدف والصوت ﴾ (ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح)

حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے' تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراء کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے' چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے' اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا۔

﴿ وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَافِیْ غَدٍ ﴾

ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ۔ [۵]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول

---

۱ ابوداؤد کتاب جہاد باب فی سجود الشکر۔

۲ بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک۔

۳ ابوداؤد کتاب الاطعمۃ باب الاطعام عند القدوم من السفر۔

۴ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

۵ بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ۔

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا' حالانکہ انصار کو گیت پسند ہے' ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی۔ ۲

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا' قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے' انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے' انھوں نے کہا تمھارا جی چاہے تو تم بیٹھ کر سنو' رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے۔ ۳

عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے' آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی۔

﴿بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما في خير﴾ ۴

تمھارے لئے اللہ مبارک کرے' تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے' اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا' اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو' ۵ اور خود کبھی پنیر' گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں' ۶ اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں۔ ۷

مسلمانوں کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کئے تھے جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے' رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ پہلے دو دن خوشیاں مناتے تھے' اب اللہ نے ان کو تمھارے لئے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا' یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن ۸ خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا' بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لئے پسند کیا گیا' عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بناء اور فتح کی' اور

---

۱ بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمہ۔

۲ بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ یہدین المراۃ الی زوجہا ودعاھن بالبرکۃ مع فتح الباری۔

۳ نسائی باب اللہو والغنا عند العرس۔

۴ ابوداؤد کتاب النکاح باب مایقال للزوج۔

۵ بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ۔

۶ نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر۔

۷ نسائی باب الہدیۃ لمن عرس

۸ نسائی کتاب صلوۃ العیدین۔

عیدالفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں میں اظہار مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا' اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں' وہ اشعار گا رہی تھیں' جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے' اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ "شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں"۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے ابوبکر! ہر قوم کے لئے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔"[1] یعنی اس دن گانا مباح ہے۔[2]

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے' ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا' اور حبشیوں سے کہا کہ "ہاں بنوارفدہ"! اس سے آپ ﷺ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا' یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ "بس" انھوں نے کہا "ہاں" ارشاد ہوا تو جاؤ۔[3]

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام "تقلیس" تھا' جس کے معنی دف بجانے' گانے اور دلچسپی کے لئے شمشیر بازی' نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں' تماشے دکھائیں' عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا' چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے' اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں' بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی۔"[4]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساط خاطر کا اظہار کر لے' اسی لئے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے' اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے' اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یاد الٰہی کے ہیں۔[5]

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو' اسی لئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا' تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں' اور دوسرے راستہ سے لوٹیں تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو' اور لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (بقرہ-۲۳) کی تعمیل ہو۔

---

[1] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام۔

[2] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔

[3] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید۔

[4] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی التقلیس یوم العید۔

[5] شرح معانی الآثار طحاوی ص ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آداب ماتم

خوشی اور غم توام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربوں میں فخر وغرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئیں تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لئے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

﴿ اذا مت فابكيني بِمَا ان اَهَلُهٗ وشقّي عَلَى الجيب يا ابنة معبد﴾

جب میں مر جاؤں تو میرے لئے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا۔

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے۔

﴿ من كان مسرورًا بمقتل مالك ﴾

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا۔

﴿ فليات نسوتنا بوجه نهار ﴾

تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آ کر دیکھے۔

﴿ يَجِدُ النساءَ حواسرًا يندبنه﴾

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں۔

﴿ يلطمن وجههن بالاسحار ﴾

اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچہ مار رہی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا آپ نے فرمایا کہ جو "شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچہ مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں۔"[1] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ "ان کے منہ میں خاک بھر دو۔"[2]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہو گئی تھی، یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن ضرب الخدود

[2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن۔

کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''وہ کون سی بات ہے' جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ ''نوحہ نہ کرو''۔ وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئیں تھیں' ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے' آپ نے منع فرمایا' لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں' بالآخران کے بار بار اصرار پر اجازت دی' لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشاء سمجھ گئیں تھیں' اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں۔ [1]

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں' اس کو عربی میں ''نعی'' کہتے ہیں' آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا' حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط مد نظر تھی کہ) وصیت کی کہ ''میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا' میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔'' [2]

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخوردان جلا کر لے جاتے' [3] آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے' راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے' تب یہ مطلب ہوگا کہ ''جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔'' [4]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے' ایک عورت انگیٹھی لے کر آئی' آپ ﷺ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ [5]

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے' صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا' ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں' لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں' اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔ [6]

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی' اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے' البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا' جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے' خوشبو نہ لگائے' اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے۔ [7]

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے' برا نہیں۔ لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی' آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب وفات پائی تو آنحضرت

---

[1] ترمذی تفسیر سورہ ممتحنہ۔

[2] ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی۔

[3] باب الاسلام یہدم ما قبلہ ص ۱۹۹۔

[4] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجھود فی شرح ابی داؤد۔

[5] اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۳۹۵۔

[6] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ۔

[7] ترمذی کتاب الطلاق باب ما جاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا۔

ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے' اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں' لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔[1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے''۔ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلاف ہیں۔ جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر وغرور کے لئے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے' اس وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز' دوست یا محلّہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں' کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہوتا ہے' آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔[2]

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے' صبر اور دعا دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ۔۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے' یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے' آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا' مگر وہ نہیں مانی' بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا' آپ ﷺ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔[3]

اللہ فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے ﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ (بقرہ۔۱۹) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں' اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے' جو کچھ ہوا اللہ کے حکم اور مصلحت سے ہوا' یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتایا ہے۔

﴿لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُم﴾ (حدید۔۳)

تا کہ تمھارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب رحمۃ ﷺ الصبیان والعیال۔

[2] فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۲۔

[3] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کرنا گواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "جمائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔" [۱] بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے، [۲] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے، [۳] اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہئے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے۔ [۴]

(۲) جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو اللہ کی جانب سے بتلایا ہے، ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفاء کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر اللہ کا شکر کرے اور "الحمد للہ" کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں۔ [۵]

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے۔ اس لئے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ [۶]

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف و تردید نہیں کی ہے، بلکہ

---

[۱] ایضاً۔

[۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس و یکرہ التثاؤب۔

[۳] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب۔

[۴] حجۃ اللہ البالغہ ادب۔

[۵] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس و یکرہ التثاؤب۔

[۶] ایضاً کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس۔

بعض کی تائید کی ہے[۱] بہر حال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے[۲] اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد ونوش نشست و برخاست اور وضع ولباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمت طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے ان کے علاوہ اور اصول وقواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں اور بعض میں نفع ونقصان کچھ بھی نہیں ہے اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع ونقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں ان مصلحتوں کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور ان امور ذیل کا لحاظ رکھا:

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات اللہ بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی اس لئے شریعت نے ان سے پہلے ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو اللہ کی یاد دلاتی ہیں۔

۲۔ بعض افعال واشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جوتا پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا۔ اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا اس لئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے

۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس۔

۲۔ فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۶۔

ہیں۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵۔ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تا کہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔[1]

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول انامؐ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں، اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول کی اتباع، روح و جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصول کار اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے، اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لئے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو[2] اور اسی لئے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیئے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تولئے استعمال میں لائیں جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے[3] پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کئے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

[1] حجۃ البالغہ ص ۳۶۳۔

[2] ہمارے فقہانے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

[3] آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت سے کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمتِ ربانی کا چشمہ نور

﴿ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْھِمْ ﴾

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا' اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آ گیا' آپ نے دیکھا کہ اسلام فلسفہ کا اخلاق کتنا مکمل' اس کی تعلیم کتنی کامل' اس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں' اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضورؐ کی صداقت کی کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ' فلاسفۂ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے' معلم امی ﷺ کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے' لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا' اخلاق عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ وشعور سے عاری تھی' نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی' اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لئے کی گئی تھی یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْھِمْ ۔ "یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک وصاف کر کے نکھار دے"۔ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پربہار بنا گیا۔ ﷺ

امیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹/ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

حصّہ ہفتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ﴾

سیرت النبی ﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گراں مایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

ع مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیٰ صاحبہا علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدی اور سیرت نبوی کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی و نسل آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات وسعت نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستندترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور

ترجمانی ہوتی' افراط وتفریط سے پاک تجدد وآزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود وتنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات ومسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں' اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات وسیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہوجاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی' قلم میں خطبات مدراس اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم' چہارم' پنجم وششم کا زور اور آبشار علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی' پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل وغیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا' لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد وکہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے' وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو' اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے میخانے کے مےخوار اور سید صاحب کی تحریرات وتحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لئے جو متفرق مضامین ومباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں' وہ اسی حالت میں کسی طرح زیور طبع سے آراستہ ہوجاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین وعشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب ونظر کو روشن کرتے' اللہ کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا' اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا' یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے' وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر ونظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے' ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط وتفریط میں مبتلا ہوگئے ہیں اور انہوں نے مغربی ومادی فلسفوں کا اثر شعوری وغیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے' اس لئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہوگیا' اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا' اس لئے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا' مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے' اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ

ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے"۔ ۱

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

"اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ رجمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا' لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا' دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا' ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ ۲

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے "میزان" کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے' سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی وانقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح وتربیت کے لئے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا' ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری امتیازات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے' وہ لکھتے ہیں۔

"اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے' یہاں تک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔" ۳

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیئے ہیں' اور یہ سیرت نبوی کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے' اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

"اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان' شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے' بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق وفرائض ہی اصل مطلوب ہیں' اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون

---

۱ سیرۃ النبیؐ جلد ۷ مقدمہ ص ۵۔

۲ ایضاً ص ۶

۳ مقدمہ ص ۲۳۔

خاطر کا باعث ہے تا کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے''۔ [۱]

اور اس کی تائید کے لئے وہ سورہ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبالؒ نے صحیح کہا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

اس لئے خطبات مدراس اور رسول وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

''اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرماں روا ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ﴾

اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔ [۲]

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیام حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔ [۳]

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات

---

[۱] مقدمہ ص ۴۷۔

[۲] مقدمہ ص ۴۹۔

[۳] مقدمہ ص۔

اور نظم حکومت کا پورا حصہ آ جاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے' لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ''نقش سلیمانی'' ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبوی' متکلم اسلام اور نابغہ عصر' استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی کسی جلد پر یہ ہیچمدان پیش لفظ لکھے' لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے' اس لئے اس پر ایک ''ناقص'' کا کچھ لکھنا محل تعجب نہیں کہ

ع دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابوالحسن علی ندوی[1] ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی !
کہ محرم نیست خسرو را زبان درگفت گوئے تو

دار المصنفین اعظم گڑھ ۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ
۷ جولائی ۱۹۸۰ء ہیچمدان مور سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمان

[1] اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ سے جو صفحات نمبر دیئے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں' اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہو گئے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہِ الطَّاہِرِیۡنَ﴾

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات:

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود:

معاملات کا اطلاق فقہاء نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقہاء شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید وفروخت واجارہ ورہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح وطلاق و خلع وتفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے [1] (جیسے قصاص وسزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین ودنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین ودنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ، اور عادات جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام، اور تیسری چیز معاملات ہے جس سے مقصود نسل ونفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجراء اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص وحدود وتعزیرات)

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیمؒ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع وفروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبروریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

[1] کشاف اصطلاحات الفنون احمد تھانوی، مطبوعہ کلکتہ ج ا ص ۲۳ بحوالہ توضیح وتلویح۔

معاملات سے ہماری مراد:

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لئے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمدؒ اس میں امارت وخلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آ جاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ وخراج وزکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں، اور اسی لئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف المتوفی ۱۸۲ھ، اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لئے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں ردوبدل اور نئی ضرورتوں کے لئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان ضابطوں اور قانون کی تفصیل ہو ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں، اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشرت میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال:

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف

ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے' ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصاً کثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیا جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے' مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا مآخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا' چنانچہ کام کا آغاز گو ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے' دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا' ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ٥ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ٥ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ﴾

دیگر مذاہب اور معاملات:

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کئے ہیں' تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں' عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں' مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الٰہی اور علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ:

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلان طبع قانون کا معیار ہے کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی' صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے' یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں' نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی:

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم‘ امیر اور غریب‘ سرمایہ دار اور مزدور‘ تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ‘ پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں‘ جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ ملک‘ قوم‘ جماعت‘ طبقہ اور پارٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لئے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی:

اس جوش وخروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی‘ آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے‘ ان تمام تغیرات کی تہہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے‘ ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں‘ تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گذر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح وعادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری:

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے‘ چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا‘ اس لئے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع‘ غرور تکبر‘ ہوا وہوس‘ رشوت اور انتفاع ناجائز وخوف وہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانون الٰہی کی ضرورت:

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دست الٰہی میں ہو‘ وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں‘ کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں‘ وہ سب کا ہے اور سب کے لئے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے جس کو اپنے لئے اور اپنی غرض کے لئے کچھ نہیں چاہئے جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے‘ ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں‘ جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ﴾ (شوریٰ: ۳)

وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔

﴿ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِیْزَانَ ﴾ (حدید: ۳)

اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

کتاب اور میزان:

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات تل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

﴿ اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَیَانَ o اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ o وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ o وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ o اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ o وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ﴾ (رحمٰن۔۱)

رحمت والا اللہ جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد وارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر کس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہئے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے۔

﴿ وَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ (انعام۔۱۹)

اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔

﴿ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ (اعراف: ۹)

تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔

﴿ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو پورا کرو۔

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ ﴾ (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیا بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں،[1] ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے۔ اس ستم پیشہ پر اللہ کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴾ (تطفیف ۱)

پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لئے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورہ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (حدید: ۳)

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دنوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہئے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی:

قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لئے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے اس لئے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہئے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (الا ماشاءاللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے در پے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے

---

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان، سورہ حدید اور سورۂ رحمان وغیرہ میں دیکھئے۔

دم بدم بدل رہے ہیں سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں' ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں' جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمران تھا' آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی' نہ چودھویں صدی' پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں' کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی اللہ کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (فتح:۳)

اللہ کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔

فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی:

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی ومعاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا' نیکی بدی نہیں بنتی' بدی نیکی نہیں' سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا' جھوٹ سچ نہیں' ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں' دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا' دوسروں کی چیز ناحق لینا' چوری کرنا' ڈاکہ ڈالنا' دوسروں کی عزت وآبرو کو داغ لگانا' دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا' حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا' کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا' لین دین میں طرفین کی رضامندی' لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام' اخلاق سوز حرکات کی بندش' فتنہ وفساد کا انسداد' ظالمانہ طریقوں کی ممانعت' ہر عہد میں ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے' البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لئے قانون الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام کے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل:

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے' یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت' کہیں وطنی افادیت' کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لئے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطہ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے' وہاں کالے گورے' یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی' یونانی اور غیر یونانی' مصری اور غیر مصری' ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیئے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے' ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے' بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے' فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت:

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لئے زمین سے فتنہ وفساد کا دفع' اس کے بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے' [1] چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود وتعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ وفساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات ومعاشرت کے اصول اور مسائل ہیں' ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام ہے' اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں' ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف' زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے' یہ قانون اللہ کا ہے' اللہ کے سارے بندوں کے لئے بنایا گیا ہے' وہ چاہے کالے ہوں یا گورے' آریائی ہوں یا سامی' یورپی ہوں یا ایشیائی' ہندی ہوں یا حجازی' عجمی ہوں یا تاتاری' سب کے لئے یکساں اور سب کے لئے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق:

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں' اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک وہ جو اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ واحد وبرحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں' مسلمان ہیں دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو' مانتے ہیں' ان کا نام ذمی ہے' لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانون الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے' یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانون الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں' یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں۔ اسلامی قانون الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں' جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ **معاملات** کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں' تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لئے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے' جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظام عدل کے مطابق قائم رکھے' اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

۱۔ اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت' حقیقت' اس کے شرائط واوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار ومصالح۔

---

[1] علامہ عز الدین بن عبد السلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام' اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب میں معاملات ملاحظہ ہوں۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے' آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی' بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی' تاکہ دنیا میں اللہ کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جا سکے اور اس کے لئے اللہ کی بادشاہی اللہ کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ﴾ (نور:۷)

اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے' یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا' جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کیلئے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے' جما دے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا' میری بندگی کریں گے' میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے اللہ کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک اللہ کا ہو جائے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (انفال:۵)

اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے اللہ کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے۔

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ (بقرہ:۲۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے' اور آخرت میں بھلائی دے' اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے' لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے' علم وعبادت' تندرستی روزی' مال ودولت' فتح ونصرت' اولاد صالح' مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے' دنیا کی بھلائی وہ ہے جو اللہ کی شریعت میں جائز ہے' ایک اور جگہ فرمایا۔

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (نحل:۴)

اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی' لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران ۱۵)

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح ونصرت' ناموری وعزت' مال ودولت اور حکومت وسلطنت ہے۔

جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، اللہ نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ﴾ (نحل:۶)

اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لئے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے، اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت وحکومت ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

﴿ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (اعراف:۱۹)

اور (اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ڮ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (ہود:۲)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴾ (شوریٰ:۳)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

﴿ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران:۱۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

مَّشْكُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل: ۲)

جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر دھکیلا جا کر اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ (نساء:۱۹)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ اللہ کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

﴿ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴾ (نساء:۸)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔

﴿ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴾ (مائدہ:۴)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ﴾ (بقرہ:۳۲)

بے شبہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (بقرہ:۳۲)

اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔

حضرت داؤدؑ کو خطاب ہوا۔:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ (ص:۲)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

﴿ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ ﴾ (ص:۳)

اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی' اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

﴿ اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾ (آل عمران:۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے۔

﴿ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۝ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ﴾ (الانبیاء:۷)

بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔اس اعلان میں اللہ کے فرمانبردار لوگوں کے لئے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے فرمایا۔

﴿ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (حج:۴)

اور البتہ اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں' زکوٰۃ دیں' اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا' وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین حق کی مدد کی جائے' جو لوگ حق کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں' اللہ ان کی مدد فرماتا ہے' ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اللہ کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہئے' چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشاء کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا۔

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (نور:۱)

اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے' اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

﴿ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (بقرہ:۳۸)

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے خبردار ہو جاؤ۔

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا' اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی

لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔[1] جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلاوطنی ہے، اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (مائدہ:۵)

یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے تو حضرت موسیٰؑ نے انہیں تسلی دی۔

﴿ اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (اعراف:۵)

اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو اللہ کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:۔

﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (اعراف:۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافت الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (اعراف:۱۶)

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے تو دفعتہً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی۔

﴿ وَقَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ

[1] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ۔

وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ○ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۱)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبر دار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا' تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا' اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی' اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لئے اور برا کرو گے تو اپنا' پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں' اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی اللہ کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی' چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے' اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ نبوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں' اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا' ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے' دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا۔

﴿ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ○ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل:۱)

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا' اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے' تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے' یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے' اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی پر ایمان لائیں' لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی' کیونکہ انہیں سنا دیا گیا۔

﴿ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ﴾ (بقرہ:۵)

تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ (بقرہ:۱۰)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا' اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا' تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا' تو تم نے اقرار کرلیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو' پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کردیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو' حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لئے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾ (بقرہ:۱۰)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی۔

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾

(بقرہ:۱۴)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو' ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں' مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہوں اور اللہ کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں' ان کے لئے دنیا

کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے' ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے' ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں' ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے۔

﴿ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (مائدہ:۵)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے' اور آخرت میں ان کے لئے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا' یہ سزا سنادی گئی

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (مائدہ:۶)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں' ان کے لئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے۔

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ ٥ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ (حج:۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے' اس کے لئے دنیا میں ذلت ہے' اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ کو وحی الٰہی نے خبردار کر دیا۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴾ (اعراف:۱۹)

(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا' اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ذلت' قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے' کیونکہ انہوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا' اللہ کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے۔

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (بقرہ:۷)

اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹادی گئی' اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے' یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لئے کہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخر خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا' لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم

رہی' اس پر اللہ نے قیامت تک کے لئے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی۔

﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۱۲)

یہ جہاں نظر آ ئیں گے' ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں' اور یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے۔

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (اعراف: ۲۱)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آ گاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں' بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے' تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کئے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب' ذلت' نکبت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے قرآن پاک کی دعا میں ہے۔

﴿ اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ﴾ (آل عمران: ۴)

اے اللہ ! سلطنت کے مالک ! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے' جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے' یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں' بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے' احکام الٰہی سے انحراف' انبیاء و مصلحین امت کا قتل و تکذیب' حرص و طمع' سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں' وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور اللہ کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیئے گئے' پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴾ (اعراف:۱۹)

(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا' ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا' اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں دربدر پھرے گا' مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

﴿ وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ ﴾ (حج:۳)

اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) اللہ رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت   بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے' اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان' اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے۔ اللہ نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا۔

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْکِتَابِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاَدْخَلْنٰھُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ○ وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ ﴾ (مائدہ:۔۹)

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا' تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی۔

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴾ (اعراف:۔۱۲)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے' مگر انہوں نے تو تکذیب کی' سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (نور:۔۷)

جولوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

﴿ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ﴾ (فتح:۳)

اللہ نے تم سے بہت سے غنیموں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی، تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الصف۔۲)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ ہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں) اللہ کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنادو۔

یہ فتح ونصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ (توبہ:)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورہ فتح وسورہ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورہ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی وکوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم

مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورہ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (انفال:۔۵)

اور لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم اللہ کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو وہ اللہ کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ٥ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ٥ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ --- وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ (فتح:۔۳)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا، اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں، اور اللہ غالب حکمت والا ہے، اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی ---- اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے، اور وہ اللہ ہی کی قدرت میں تھیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی۔

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ (فتح:۱)

(اے محمد ﷺ!) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا۔

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ٥ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ٥ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ﴾ (نصر:۱)

جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار

کی حمد کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی' طاعات اور عبادات کی دعوت' فرائض و حقوق کی ادائی' قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی' ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی' اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا' اور عقائد و ایمان' شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کیلئے بمنزلہ تمہید تھے' بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں' اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے' تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں' اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے' اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًاؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ﴾ (نور:۷)

جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا' وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطاء، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو' اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا' اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا' اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی' جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے' ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں' لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔[1] کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی بادشاہی نہ تھی' بلکہ روئے زمین پر اللہ واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا' اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا' اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دو نہیں ہیں' ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے' جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔

تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں روا ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ﴾ (زخرف۔۱۰)

اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی اللہ کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورہ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے، [1] مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے۔

﴿ وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ (مزمل۔۲)

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا، اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ اللہ کی قسم محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل و بیہقی و حاکم و احمد۔

''اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے''۔

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے اللہ سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا فیصلہ آ جائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی وسیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے، ابو طالب بھتیجے سے کہتے تھے جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا، ابو جہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں، اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔ [1]

حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں ''اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے'' [2]

بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انامؐ کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور

---

[1] سیرۃ ابن ہشام۔

[2] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۵، لائیڈن۔

فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے' اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب وعجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں' ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے' زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے' اور جس سے تم اپنی اور اہل عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے' انصاری نے ایک آواز سے کہا' ہاں! یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح ونصرت۔[1]

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمہ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے' دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی' اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام میں قائم کرنے کے لئے عرب وعجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ اللہ کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہؓ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں' جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا' انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوہ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا' مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے' حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں' دم بہ دم خبریں آرہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آرہا ہے' آنحضرت ﷺ اور جان نثار صحابہؓ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں' حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر' پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں' اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں' اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے' فاقہ کش' غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے' لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مدائن تمہارے ہاتھ آئے گا' قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے' مصر کا تخت تم کو ملے گا' تم سے اور ترکوں سے جن کی

[1] طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹ لائیڈن۔

آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے جنگ ہوگی ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا' بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔[1]

لیکن ان خوشخبریوں' بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ حکومت' یہ بادشاہی، یہ تخت' یہ تاج' یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں' یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں' اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں' اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو' دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت' شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف اللہ کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے' اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت' یہ عیش و عشرت' یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال' سوء مآل کا موجب ہو جائے گا' اسی لئے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لئے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے' یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے فوز و فلاح کا موجب ہے۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴾ (شوریٰ: ۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو' اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۱۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے' اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو' کیونکہ یہاں کی لذت' عیش و عشرت' آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ' ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ﴾ (نحل: ٦)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے لئے وطن چھوڑا' ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا۔

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

﴿اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾(توبہ:۶)
کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

﴿وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُھَا وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (قصص:۶)
اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاo وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾ (اعلیٰ:۱)
مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

﴿وَالدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (اعراف:۲۱)
اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں۔

﴿فَاَذَاقَھُمُ اللّٰہُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾(زمر:۳)
پھر ان کو اللہ نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے۔

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی﴾ (طہٰ۷)
اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا نُوَفِّ اِلَیْھِمْ اَعْمَالَھُمْ فِیْھَا وَھُمْ فِیْھَا لَا یُبْخَسُوْنَo اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْھَا وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾(ہود:۲)
جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پر کاہ سے بھی کمتر ہے:

﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ (توبہ۶)
دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾(رعد۳)
اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران۱۹۔حدید۳)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے۔ جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے۔

﴿ اِنَّ الدُّنیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ ﴾

دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں۔

﴿ هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لئے بنا۔

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ﴾ (الذاریات: ۳)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے۔

﴿ وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا ﴾ (قصص: ۷)

اور اللہ نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں ﴿الدُّنیا مزرعة الاٰخرة﴾ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، فرمایا گیا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ وَّمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (نور: ۷)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا، اور خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

اللہ نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ

وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہ ہو کر میری اطاعت' عبادت اور میری احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں' اور اگر اس امن واطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا' نماز کا قیام' زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ (حج:۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں' اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں' اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں' اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول' نہ غنیمت کی فراوانی' نہ دولت کی ارزانی' نہ تجارت کا فروغ' نہ جاہ ومنصب کا فریب' نہ عیش وعشرت کا دھوکہ اور نہ شان وشوکت کا تماشہ ہے' بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جدوجہد اور سعی ومحنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہد نبوی میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت' بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں' لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی' چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا' چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوہ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے' دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق ومغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں' مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کررہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی وشامی حدود پر آکر ملتے تھے' عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب وتمدن کا نام نہ تھا' وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے' یمن، بحرین' عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی' جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے' غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا' رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا' چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا' عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا' ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا' اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط' سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی وتمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو' بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت وفرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہی ہے' اس طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی' چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شرع کیا' تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے' قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ (بقرہ۔۱۷)

اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی' چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ' حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا' وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتداء میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سرداران قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی' آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دینا تھا' چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک آپ نے لکھا تھا' اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا' اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نور اسلام سے منور ہو چکا تھا' لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاج مرصع اور تخت زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی' نجاشی بادشاہ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا' یمن کے تمام رؤساء نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا' عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی' آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوہ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا' اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا' چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا۔

﴿ اَلْیَوْمَ اسْتَدَارَالزَّمَانُ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خودساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف قصر کسریٰ وقیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحہ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی۔

﴿ اِذَاھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَاِذَا ھَلَکَ قَیْصَرَ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ ﴾

جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون اللہ کا قانون، جس کی حکومت اللہ کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک اللہ کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا، یا اس کو یوں کہیے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں حاکم ہے، شوہر اپنے اہل وعیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا کہ ﴿ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ﴾ ۔یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ وجہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمح نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص وہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمان الٰہی کے آگے سارے بندگان الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں اللہ کے بندوں کو بندوں کا اللہ ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشاء سلطنت کے قانون، طرز سلطنت، طریق حکومت اور عدل وانصاف اور احکام کے حق وباطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری ومعنوی خصوصیات کے سبب

سے ہوا' ظاہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے' اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے' کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی عرب کی فطری شجاعت' کوہ شکن عزم و استقلال' زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں' اور ان اوصاف کی جلاء اخلاص' للّٰہیت' صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاق روحانی ہی سے ممکن تھی' اس لئے اولاً ان کو اس طرز حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال' رعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا' مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ' مامور من اللہ' ایک پاکباز راہنما' ایک مقدس امیر' ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ' ایک ایسا پاک احساس' ایک ایسا روشن ضمیر' ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے' اونچے نیچے' کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی' یمن اور بحرین کے ایران نژاد' نجد و حجاز کے عرب' حبش کے حبشی' سب ایک ہی سطح پر آ کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے' الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی' وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرۃً خوددار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے' عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں' لخمی' حمیری' غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں' یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں' اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی' وہ بھی اسی نقشہ پر تھی قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے' چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سرداران قبائل کے لئے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے' یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ' مرباع' نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے

آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا' چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا' کہتا ہے۔

﴿ وننکران شئنا علی الناس قولھم ولا ینکرون القول حین نقول ﴾

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے۔

سرداران قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا' چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الاحمی اللہ ورسولہ اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے' ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا' نشست کے لئے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کئے گئے' سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لئے حرام ٹھہرے' امام وقت اور اس کے احکام کے لئے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا' حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے' چاؤش و نقیب رخصت کر دیئے گئے' طلائی و نقرئی و زمرد یں تخت اٹھوا دیئے گئے' امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے' اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی' چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا' ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے' چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرما لیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے' آپ اس کو پہنیں' اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے' آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا' چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں' لوگ اشارہ سے بتاتے' صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے' جس پر آپ جلوہ افروز ہوں' مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے' مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے' اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت

سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے' ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہؓ کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دیدی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے' پھر فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔ [1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے' ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر ٹوٹ پڑا' آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی' آپ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا' آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آ ؤ اور مجھ سے قصاص لو' لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔ [2]

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں' حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے' انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا' جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا' معاف فرمایا' اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہوئے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں' بخلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لئے جو خاص خطاب اللہ سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں' عبدیت کا ملہ ہی آپ کا کمال تھا' اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق [3] قرار دیا تھا' آپ نے ان سب کو مٹا دیا' فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے' ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لئے ہے' آپ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا' چونکہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے' اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کر دیا' لیکن جب آپ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد و اذا رفع الی السلطان۔

[2] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸ کتاب الحدود۔

[3] ابوداؤد۔

کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔[1]

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔[2]

ایک بار آپ نماز پڑھ رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: ''اللہ! مجھ پر اور محمد پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر'' آپ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ''تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا''[3] حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات ومحاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی وخاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے، زکوٰۃ صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکم الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے۔

﴿قال ما او تیکم من شیئی و ما امنعکم ان انا الاخازن اضع حیث مالامرت﴾[4]

میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

﴿انما انا قاسم و الله یعطی۔﴾

میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے۔

---

[1] بخاری باب الکسوف۔

[2] مسند ج ۳ ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریع۔

[3] بخاری ج ۲ ص ۸۸۹ کتاب الادب۔

[4] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والامارۃ۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار رہوتا تھا' اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا' اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدنی اپنی صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے' چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں' دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی' ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں' حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا' ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے' اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں' حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا' عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں' جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں' اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں' ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ اللہ آپ کی امت کو فارغ البال کرے' کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ اللہ کی پرستش نہیں کرتے لیکن اللہ نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیئے ہیں' آپ ﷺ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں"۔ [1]

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور ﷺ کے لئے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے' جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع [2] ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو

---

[1] بخاری و مسلم کتاب النکاح باب الایلا۔

[2] یعنی پیوند دار کپڑا (معارف)

شکست دے رہے تھے۔

قیسؓ بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ یہ کیا؟ عرض کی: یارسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔[2]

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی اللہ کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہؓ نے بھی اس کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہریں تھیں، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔[3]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنعات اور غلامی و

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح۔

[2] ابن ماجہ کتاب النکاح۔

[3] یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں۔

عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور ﷺ کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے، عرض کی تو قبول سے معذور ہوں، آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔[1]

غزوہ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہئے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

﴿ انتم اعلم بامور دنیاکم ﴾

تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت ﷺ کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو۔[2]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن

---

[1] صحیح بخاری باب تکون الحرة تحت العبد و باب شفاعة النبی ﷺ فی زوج بریرہؓ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے

[2] صحیح مسلم باب الفضائل۔

جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت الٰہی پر مبنی ہوتا جس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا‘ کیونکہ ان کا منشاء حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کرلی تو حضرت عمرؓ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے اس لئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہوگئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بے شبہ ہوں‘ انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں‘ انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا‘ وہ میری مدد کرے گا‘ انہوں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے‘ لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی‘ انہوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول اللہ ﷺ نے دیئے تھے‘ آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا‘ روزے رکھے اور غلام آزاد کیا‘[1] اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی‘ مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا‘ کیونکہ یہ فیصلہ ارادات ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا‘ تو چونکہ ان کے شدت شوق زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا‘ جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے‘ ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا‘ آپ نے واقعہ بیان فرمایا‘ حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں‘ آپ خود اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا‘ شمع نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے‘ پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں‘ حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم

---

[1] بخاری ج ۱ص ۳۸۰ کتاب الشروط۔

النفس اور امور تجربہ سے تھا' اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ [1]

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی' ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے' لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی' صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا' انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں' اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں' آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا' قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے' دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے' لیکن آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کر لو' پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو' یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یارسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں' یہ سن کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا' تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا' اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے' [2] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے' یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے' قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا' آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمرؓ کو غصہ آ گیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں' لیکن آپ نے ان کو روک دیا [3] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی' یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ اس کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا' یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں' تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے

---

[1] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا' بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں' جن سے کبھی ان استادوں کو اس لئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی۔

[2] ابوداؤد کتاب الفقہ ج ۲ ص ۷۶۔

[3] بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم وشفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے' آنحضرت ﷺ کے اس طرز عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لئے حق شناسی' حق گوشی' حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ واعزاز اور فخر وغرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لئے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے' عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی' اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو' یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو' اخلاقی طور پر سے دونوں کو سمجھا دیا' حکام وعمال سے فرمایا ''ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی' اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو''۔ [1]

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور ﷺ سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا' اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف وکرم فرمایا' اور عدل وانصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو' کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا' حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ' نہیں استغفر اللہ' نہیں استغفر اللہ' اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو' مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا' پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ [2]

ایک دن ایک بدو آیا' جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا' بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں' اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی' صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں' آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اس کا حق ہے' اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا' اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ [3]

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا' آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں' آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا' گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے' باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا' لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں' اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی' لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں' اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے' پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا' اس نے پھر وہی لفظ کہے' لوگوں نے پھر روکا' آپ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو' اس کو

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکوٰۃ باب الرضاء السعادۃ۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب العلم۔

[3] ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا' دیکھنے کے ساتھ بولا: ''محمد! تم کو اللہ جزائے خیر دے' تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی''۔ [1]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے' ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے' جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا' میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت وست کہہ کر کہا کہ ''اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو'' حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے' اس کی طرف منہ کر کے کہا: او اللہ کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی' اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے' اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں' یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو' یہودی حلم وعفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ [2]

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا' اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا' پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا' اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے' حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے' آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا' اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں' آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔ [3]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور ﷺ جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے' لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا' آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا' اور معاملہ کا فیصلہ کیا' یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی' ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تبختر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے اس سے بھلا برا جو کچھ ہو' وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸۔

[2] یہ روایت بیہقی' ابن حبان' طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی)۔

[3] جامع ترمذی کتاب البیوع۔

اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دارو گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہوسکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا' اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی' بایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرات کو جائز رکھا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپ کا یہ اسوہ آئندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لئے عملی سبق ہو' اور اس کے لئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ آنے والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھی' ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا' لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں' ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع' اس خاکساری' اس عفو و حلم' اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا' اور نہ آ سکتا تھا' وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے' زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا' جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی' اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے' بلکہ اس ذات اقدس سے ہے' جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی' صلوٰت اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے' ایک تو اس لئے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے' اس لئے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کے لئے مثال و نظیر کا کام دے' آپ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ (آل عمران: ع ۱۷)

اے رسول! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضور نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی' انہوں نے عمل کیا تو

اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اوران کی خصوصیت ظاہر کی کہ

﴿ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ (شوریٰ ع ۴)

ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگر چہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع واستقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا' اوران کی رایوں پر عمل کیا' اوراس کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تا کہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو' نہایت مناسب ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے' اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا' یہود ونصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق وناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا' بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی' لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا' آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا' انہوں نے **الصّلوٰۃ جامعة** کہہ کر پکارا' اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1] اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آکر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا' چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی' یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے' اللہ کی قسم! اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا' ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی یارسول اللہ! آپ حسب فرمان الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے' اس پر انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تا کہ پانی اپنے قبضہ میں رہے' آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا' اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔[2]

---

[1] مصنف عبدالرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المرسل لابی داؤد وفتح الباری ابن حجر وروض لانف سہیلی وزرقانی علی المواہب ونووی شرح مسلم باب بدءالاذان، نووی میں ہے فشرعه النبی ﷺ بعد ذلك اما بوحی اوباجتهاده ﷺ علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له ﷺ ولیس هو عملاً بمجرد المنام هذا مالا یشك فیه باختلاف۔

[2] ابوداؤد وترمذی باب بدءالاذان۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کئے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے' لوگوں نے مختلف رائیں دیں' آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ ۱؎

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں' اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے' پھر پرجوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے اور حضور کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے' واپس کر دیا جائے' آپ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے' ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا' ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا' اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی اگرچہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی' پھر بھی آپ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں' اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے' جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میرے رائے سے اتفاق نہ ہو' وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں' جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا' ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا' تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں''۔ آپ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا' فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے' اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لئے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہئے' چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ ۲؎

احادیث کی کتابوں کا استقصاء کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا' اس شعبہ حیات کو جس میں تمام تر درندگی' بہیمیت' مکروفریب' دغل وسازش ظلم وستم اور جوروتعدی شامل تھی' اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے' اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک وبلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا' احادیث میں متعدد صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ ﴿ السُّلطان ظل اللّٰہ فی الارض یاوی الیه کل مظلوم من

۱؎ ترمذی ص ۵۰۳ کتاب التفسیر سورہ انفال۔

۲؎ ابوداؤد کتاب الجہاد وصحیح بخاری کتاب المغازی۔

عبـاد الـلّٰہ﴾ [1] یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگان الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ

﴿السُّلطان العادل للتواضع ظل الله و رمحه فی الارض﴾ [2]

عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا: ''عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا''۔

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بد دیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔ [3]

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گذاری، اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے، تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے، ہر فرد رموز

---

[1] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابو ہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیق ابن ابی شیبہ میں ہے۔ یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء ومزین الالتباس عطاء حلبی لفظ سلطان یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت وقوت کے ہیں جو انگریزی لفظ پاور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہیں اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے السلطان ولی من لا ولی له یعنی جس کو کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لئے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

[2] صحیح بخاری۔ باب فضل من ترک الفواحش۔

[3] صحیح بخاری۔ باب فضل ترک الفواحش۔

سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے ہزاروں لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے لیکن بایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرات و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب وثواب سمجھتا ہے اس لئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ وزکوٰۃ کی گرانباری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیئے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے۔[1]

﴿کان رسول اللہ ﷺ اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللّٰھم صلّ علی ال فلان، فاتاہ ابی بصدقۃ فقال اللّٰھم صلّ علی ال ابی اوفی﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۳)

آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفی کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ بن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا ملتا تھا جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

انّ اول صدقۃ بیضت وجہ رسول اللہ ﷺ ووجوہ اصحابہ صدقۃ طی جئت بھا (مسلم ج ۲

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل۔

کتاب الفضائل)

پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کا چہرہ چمک اٹھا' قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ صدقات قومنا۔﴾ [1]

یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔ [2]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے' چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں' زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں' یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز بن مالکؓ ایک صاحب تھے' انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا' جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یارسول اللہ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یارسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے' آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا' انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے' اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے' چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا' جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ کو قبول کر

---

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب اتقو النار ولو بشق تمرۃ کتاب الاجارۃ باب من اجر نفسہ۔

[2] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب اتقو النار ولو بشق تمرۃ کتاب الاجارۃ باب من اجر نفسہ۔

لیتا۔[1]

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا' کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا' لیکن انہوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو' چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا' حضور ﷺ نے ان کی شدت علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔[2]

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنھوں نے آ کر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے' گو ہم بستر نہیں ہوا' تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرمایئے۔[3]

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا' دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا' آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریف کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا' مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں' ایک نے اٹھ کر کہا یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے' ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے' لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا۔ یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لئے دعا فرمایئے۔[4]

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں' دنیوی سلطنت میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی' لیکن ماعزؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے' اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے' دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لئے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی' دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے' لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے' ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے' بڑے بڑے

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۵ و صحیح بخاری کتاب الحدود۔

[2] ابوداؤد باب فی اقامۃ الحد علی المریض۔

[3] ایضاً باب یصیب الرجل ودن الجماع و صحیح بخاری حدود۔

[4] ابوداؤد کتاب الدیات۔

جرائم درگذر کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق وملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطبؓ ابن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا اللہ کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کردوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے اللہ اور رسول کے اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے فرمایا، کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر اللہ نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةَ ﴾

جو چاہو ہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

﴿ حسن الظن من حسن العبادة ﴾ (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸)

حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

---

[1] بخاری ج ۲ و کتاب المغازی ص ۵۶۰۔

﴿ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ ﴾

بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔

﴿ انّ الامیر اذا ابتغی الریبة فی الناس افسد ھم ﴾

جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

﴿ عن معاویة قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول انك ان اتبعت عورات الناس افسدتھم و کدت ان تفسد ھم ﴾

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دو گے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہؓ کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگذر کرو"، دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ

﴿ من رای عورة فسترھا کان کمن احیی موؤدة ﴾ [1]

جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النھی عن التجسس میں ہیں۔

''جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات' جسم' حسن' ڈیل ڈول' وسعت علم' حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا' ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے' اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے' اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے' سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے' اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے' اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے' اسی کا نام بادشاہی ہے' پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے' اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لئے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے' سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے' کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو' سخت گیر ہو' لوگوں کے معائب کی کرید کرے' ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے' اور لوگ ان سے بچنے کے لئے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے' وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلوتہی کرتے ہیں' اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے' اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے' جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے' ان کے گناہوں سے درگذر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں' پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے' سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے' لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں' مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے' جاننا چاہئے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے' نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے' بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دوررس ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں' اس لئے لوگوں کو تکلیف مالایطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں' اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو' اور حاکم کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب زیاد بن ابوسفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا' کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں' میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔''

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے' اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے' لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری' جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں' مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے' وہ سراسر مذہبی ہے' اس میں امیر کے احکام کی اطاعت اللہ کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے' اس لئے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے' جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو۔ عدل میں صداقت کی

خلاف ورزی نہ ہو' امیر وغریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں' مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے' اثبات جرم میں شکوک وشبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم وجابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں' ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے' چنانچہ فرمایا۔

﴿ انّ اللّٰہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا ﴾

بے شبہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم وستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیض صحبت اٹھایا تھا' انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا' ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے تھے' انہوں نے اس کی وجہ پوچھی' لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے' انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔ [۱]

دنیوی حکمراں لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں' غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے' لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا' بلکہ لطف ومحبت اس کا خمیر تھا' اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا' معاملات حکومت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا' چنانچہ یہودیوں میں دو مرد دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہئے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں' یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔ [۲]

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں' مجھ پر حد جاری فرمائیے' آپ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں' آپ نے دریافت فرمایا کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں' آپ نے فرمایا: جاؤ اللہ نے معاف کر دیا۔ [۳]

---

۱ مسلم ج ۲ ص ۳۹۷ کتاب الادب۔

۲ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۹ کتاب الحدود

۳ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۲ کتاب الحدود۔ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لئے بحکم ان الحسنات یذھبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لئے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی' ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے' آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں' چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا [۱] عدیؓ بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں' لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے' اور حضور ﷺ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے' ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا' [۲] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لئے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا' لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے' تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے' ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا [۳] لیکن آخر ایک [۴] رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی' صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو' سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا' آپ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں ہاں! یارسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب اللہ کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں' تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں' فرمایا: ایک غلام آزاد کردو' انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں' آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو' عرض کی یارسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے' آپ نے فرمایا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو' عرض کی یارسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے' آپ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنوزریق کے عامل کے پاس جاؤ' وہ تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بچوں کو کھلاؤ' وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں

---

[۱] مسلم ج ۲ ص ۲۹۴

[۲] بخاری ج ۲ ص ۹۰۰

[۳] اظہار کے معنی ہیں کہ بیوی کو محرکات شرعی سے تشبیہ دیدی جائے' جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

[۴] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نامہ نازل نہیں ہوا تھا۔

وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص وعقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی' عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی' خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا' لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو ان ہی خودسر' سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا' اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے' ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا' سفر سے پریشان' بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے' فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں' عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں' لیکن یہ کہ نفل پڑھو' پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے' سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں' لیکن یہ کہ نفل رکھو' پھر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا' اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں' مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو' اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ اللہ کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا' یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا۔ (بخاری' کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کو اللہ نے بھیجا ہے' ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا' اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا' اللہ تعالیٰ نے' اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا اللہ تعالیٰ نے' اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے' اس نے کہا: اس اللہ کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا' اور پہاڑ کو کھڑا کیا' اور ان میں فائدے رکھے' کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں' اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا' کہا' قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا' کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بیشک! پھر کہا' آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا' اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا' کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں' فرمایا: ہاں! سچ کہا' عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا' کیا اللہ نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا' ہاں اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا' ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہو گا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا' پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا' پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا' تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں' اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے!

حضور ﷺ نے فرمایا' ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا' فرمایا جو چاہو پوچھو' اس نے کہا میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا' اللہ ہاں! پھر فرمایا اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا' اللہ ہاں! پھر کہا اللہ ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولتمندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: اللہ ہاں! اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں' اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہوں (بخاری' کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی' بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سنئے:

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے' صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت کے جاں نثار تھے' وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گذرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا' براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا' وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے' بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابوداؤد' کتاب الحدود' ج۲ ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری' خلوص' جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے' آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے' صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم وایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی' چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے' عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے' لیکن جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا' مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو' عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکا اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے' جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے' لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے' وہ اس منظر جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں' میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں' لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمد کے اصحاب محمد کی تعظیم کرتے ہیں' جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں' جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے۔ جب آپ

وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے۔ جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے' لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔ [1]

غزوہ بدر کے متعلق جب آپ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش' خلوص' عقیدت' محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے' انہوں نے کہا:

﴿ ایانا نرید یارسول اللّٰه والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخیضها البحر لا خضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برك الغماد لفعلنا ﴾ (مسلم کتاب الجہاد باب غزوہ بدر)

یارسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد [2] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوہ احد میں جب آپ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپ کو روکا' اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے' انہوں نے کہا:

﴿ بابی انت وامی لاتشرف یصبك سهم من سهام القوم نحری دون نحرك ﴾ (بخاری کتاب المغازی' غزوہ احد)

میرے باپ ماں آپ پر قربان' آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھئے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے' میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے' آنحضرت ﷺ کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا' تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں' فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لئے آپ نے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو مقرر فرمایا' وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی' اس پر یہودیوں نے کہا "یہ تو بہت ہے"۔ انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں' تم لوگ اس کا نصف لے لینا' اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

﴿ هذا الحق به تقوم السّماء والارض قدرضینا ان تاخذه بالذی قلت ﴾ [3]

انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی' لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنان خدا تم

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۷۷ کتاب الشروط۔

[2] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

[3] ابوداؤد ج ۲ ص ۵۷ کتاب البیوع۔

مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، اللہ کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان وزمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔[1]

۱ فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۳۱۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو[1] اس تعلیم میں قیصر اور اللہ دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے ﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام ﴾ (اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے مگر سلطنت الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہ و تعالیٰ اسمہ، بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکام الٰہی کی بجا آوری ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ (نسا:۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں

﴿ من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصٰی امیری فقد عصانی ﴾ [2]

---

[1] انجیل۔

[2] صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲ ص ۲۲۳ مصر۔

جس نے میرے امیر کا کہا مانا' اس نے میرا کہا مانا' جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے' احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے' یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعت الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو' غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے' اللہ کے لئے اور اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الٰہی کیا جائے وہ دین ہے' امام کی امامت' خلیفہ کی خلافت' راعی کی رعیت' والی کی ولایت' امیر کی امارت' حاکم کی حکومت' رعایا کی نگرانی' قاضی کی دادگری' عمال کا عمل' سپاہی کا قتال' مجاہد کا جہاد' محاصل کی ادائی' امراء کی واجبی اطاعت' غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکام الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے' وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الٰہی میں مصروف رہیں جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے' فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں' حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند داد خواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤدؑ کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے' قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے' حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤدؑ کو متنبہ کیا گیا۔

﴿ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (ص:۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی اللہ نے) ان کو آزمایا ہے' تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے' اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے' تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الٰہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ما من امام يغلق بابه من ذوی الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته و حاجته و مسكنته﴾ (ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷)

جوامام وحاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔

﴿من ولی من امر المسلمين شيئاً فاحتجب دون خلتهم و حاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عزّوجل يوم القيامة دون خلته و فاقته و فقره﴾ (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ۴ ج ۴' ص ۹۳ حیدر آباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت واحتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں [1] کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی' حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی تھے' اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا' جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا' وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی' حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔ (ابن حنبل ج ۱ ص ۵۴ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمدورفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ (ترمذی ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل وانصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے' خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (نساء: ۸)

---

[1] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے اذن کا حکم ہے اس لئے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات' مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو اللہ تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾ (رحمٰن:۱)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو۔

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴾ (مطففین:۱)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (مائدہ، حجرات:۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (آل عمران ۶-۱۴)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (شوریٰ:۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو یا عام بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ﴾ (مائدہ:۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں' ارشاد ہے

﴿ الا ایھا الناس لا یقبل اللہ صلوۃ امام حکم بغیر ماانزل اللہ ﴾ (مستدرک ج ۴ ص ۸۹ کتاب الاحکام)

ہاں اے لوگو! جو امام' اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے' اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے' اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے' وہ منافق ہے اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت وفرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں' ان کے لئے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے' اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں' فرمایا۔

﴿ الامام الذی علی الناس راع ھو مسئول عن رعیتہ ﴾ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام)

وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں' اسلامی امارت وخلافت تاج وتخت کی بہار اور عیش وعشرت کا گلزار نہیں' ذمہ داریوں کا خارزار ہے' جو اس سے بسلامت گذر گیا اس کے لئے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام وآرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل وبدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا وخوار ہوگا۔

﴿ ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنسحتہ الالم یجد رائحۃ الجنۃ ﴾ (بخاری ومسلم حوالہ سابق)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیرخواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا۔ انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے۔

﴿ ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت و ھو غاش لرعیتہ الا حرّم اللہ علیہ الجنۃ ﴾ (مسلم' کتاب الامارہ)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے' وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کردے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے' ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمروؓ ہے' وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔

﴿ انّ شرّ الرّعاء الحطمة ﴾ (مسلم' کتاب الامارہ)

سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن' اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں' فوراً بولے' کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا' بھوسی تو اوروں میں تھے' اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا' بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے' ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا' لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا' نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے' انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی' صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو' پھر اس کے بعد والے کی' پھر عہد بہ عہد اوروں کی' ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش اللہ پر چھوڑ دو)

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ ﴾ (صحیح بخاری)

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق بازپرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے

﴿ اللهمّ من ولی من امرامّتی شیئاً فشق علیهم فاشقق علیه و من ولی من امرامّتی شیئًا فرفق بهم فارفق به ﴾ (مسلم)

اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں' اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

﴿ الا کلّکم راعٍ و کلّکم مسئول عن رعیته والرجل راعٍ علی اهل بیته وهو مسئول عنهم والمراة راعیة علی بیت بعلها وولده وهی مسئوله عنهم والعبد راع علی مال سیده و هو مسئول عنه الا فکلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیته ﴾ (مسلم وصحیح بخاری)

ہاں! تم سب نگران کار ہو اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگران کے متعلق بعض پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائیگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے' اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا' اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا' تو ہاں ہشیار رہو' تم سب نگران کار ہو اور

تم سے اس کے زیرنگران کے بابت باز پرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت:

اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے' جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے' اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے' حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں' یہ الفاظ لفظ ''رعیٰ'' سے نکلے ہیں' جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں' راعی چرواہا اور رعیہ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے' اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش ونگرانی اور حفاظت کسی راعی ومحافظ کے سپرد ہوتو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق ومحافظ چرواہے کی ہے' جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے' درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے' اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور ﷺ کی زبان مبارک پر لفظ ''رعیت'' کس قدر شفقت آمیز اور پرمحبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم وسفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کررہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے' جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدبرآ ہوں گے' رسول اللہ ﷺ نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے۔

﴿ان المقسطين عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمٰن و كلتايديه يمين الذين يعدلون في حكمهم و اهليهم و ما ولوا﴾ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام وامراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے' اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیرحکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں' منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی' ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے' جامع ترمذی میں ہے

﴿ان احب الناس الى الله يوم القيامه و ادناهم مجلسًا امام عادل و ابغض الناس الى الله و ابعدهم منه مجلسًا امام جائر﴾ (ترمذی ابواب الاحکام)

بے شبہ سب لوگوں سے اللہ کو محبوب اور اللہ سے قریب امام عادل ہوگا' اور اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور اللہ سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم وامیر عدل وانصاف اور رعایا پروری اور خیرخواہی سے دور ہوں گے وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے' فرمایا

﴿ما من اميريلي امرالمسلمين ثم لا يجهد لهم الالم يدخل معهم الجنة﴾ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو' پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیرخواہ نہیں' وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

﴿ما من وال یلی رعیة من المسلمین فیموت و هو غاش لهم الا حرم الله علیه الجنة﴾
(صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو اس پر جنت حرام ہے۔

﴿انما الامام جنة یقاتل من ورائه و یتقی به فان امر بتقوی الله و عدل فان له بذالك اجرًا و ان امر بغیره فان علیه وزرًا﴾ (نسائی کتاب البیعہ)

امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت وریاست اور سلطنت وولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب وعذاب اور جزاء وسزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور واعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال وعبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں یا قوانین الٰہی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت وولایت اور حکومت وریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام وانصرام بھی دین ہی کا ایک جزء ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل وتدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہئے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے۔

گدائے[1] گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز واسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار؟)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ اور اجراء کے لئے ہے اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر وثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے۔

---

[1] حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار ومصالح کے تلاش نہیں کرنی چاہیے جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز ومصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز واسرار کی تلاش وطلب نہیں کرنی چاہیے۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا زَحۡفًا فَلَا تُوَلُّوۡهُمُ الۡاَدۡبَارَ ۞ وَمَنۡ يُّوَلِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰٮهُ جَهَنَّمُ ‌ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴾ (انفال: ۲)

اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہوتو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جاملنا چاہے ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

﴿ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ‌ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ‌ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾ (بقرہ: ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صنفوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

﴿ فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴾ (آل عمران: ۲۰)

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں ان کے گناہ دور کردوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا اور جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلہ ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورہ نور میں ہے۔

﴿ وَّلَا تَاۡخُذۡكُمۡ بِهِمَا رَاۡفَةٌ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ ﴾ (نور: ۱)

اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے اسی طرح سورہ بقرہ کی اس آیت میں

﴿ وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ ﴾ (بقرہ: ۲۳)

اوران سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو''دین''فرمایا گیا ہے' سورہ انفال کی اس آیت میں

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (انفال: ٤)

اوران لوگوں سے قتال کرتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم وقانون الٰہی کی تسلیم واطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے' یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے' اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ (انعام' یوسف) ﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ﴾ (نحل:۷)

اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہیں۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت:

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت وولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش وتنعم کے ایوان زرنگار' تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں' یا جلال وجبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سائے میں' لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے:

سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے' بلکہ اسلام نے سلطنت' حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے' قطعاً چھوڑ دیا' سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا' ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے' مگر تعلیم محمدی نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے' پرہیز کیا' الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا' اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے' چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے۔

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ ﴾ (ناس:۱)

کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں' لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی' لوگوں کے معبود برحق کی۔

﴿ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ ﴾ (حشر:۳)

بادشاہ حقیقی' پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا' تو اللہ جو سچا بادشاہ ہے۔

﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ (مومنون۔٦)

تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔

﴿الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (جمعہ:۱)

بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ''الملک الحق'' یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس ''لوگوں کا بادشاہ'' کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس ''لوگوں کا پالن ہار'' بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم وصفا کی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت ولی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگادی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت:

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

﴿ان اخنع الاسماء عنداللّٰہ رجل تسمی ملك الاملاك﴾ (صحیح بخاری، کتاب الادب)

سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، توراۃ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلّف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزاء وسزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکام الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے

ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ (بقرہ:۴)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے' جو بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے' اس لئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے' چنانچہ فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل:۷)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی' اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں' اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ کے قائم مقام تھے' ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ:۴)

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ' اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے' تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورہ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ (اعراف:۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے' تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا' پھر تمہاری صورتیں بنائیں' پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی' اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی' سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

---

[1] خلافت کی تحریک کی زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اسکی تصریح کی گئی ہے' یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (انعام:۲)

اور وہی (اللہ) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا' تا کہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطاء کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے' جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ ﴾ (اعراف:۹)

اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا:

﴿ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ ﴾ (اعراف:۱۰)

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

﴿ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴾ (ہود:۵)

تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہے۔

﴿ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴾ (انعام:۱۶)

اور اللہ چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا۔

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (نور:۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے' وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰئِفَ الْأَرْضِ ﴾ (انعام:۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔

سورہ یونس میں تصریح ہے۔

﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (یونس:۲)

اورتم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب انہوں نے ظلم اختیار کیا' ہلاک کر چکے ہیں' اوران کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے' مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں' پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ ﴾ (یونس:۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورہ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿ هُوَالَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ﴾ (فاطر۔۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا' تو جس نے کفر کیا اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے

حضرت داؤد کو خلافت بخشی گئی:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ (ص۔۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے' تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں' اس لئے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو' اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ﴾ (مریم۔۷)

تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے' دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

﴿ وَاخْلُفْنِىْ فِىْ قَوْمِىْ ﴾ (اعراف۔۱۶)

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِى الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴾ (زخرف:۶)

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے' پہلی آیت میں ایک کے

مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں۔

﴿ الخلافة النيابة عن الغير امالغيبة المنوب عنه و امالموته وامالعجزه وامالتشريف المستخلف ﴾ (ص۱۰۰ مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں۔ اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنی کے لئے مختلف قول نقل کئے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اس کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے۔

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ (حدید:۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں۔ کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے

﴿ ان الاموال التي في ايديكم انما هي اموال الله بخلقه و انشاء لها و انما مولكم اياها و خولكم للاستمتاع بها و جعلكم خلفاء في التصرف فيها ﴾

وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمھارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے' کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے' اسی نے تمہارے تمتع کے لئے اس کا تم کو مالک بنایا ہے' اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے۔

﴿من الاموال التی جعلکم اللّٰہ خلفاء فی التصرف فیھا﴾

وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے۔

﴿جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ عز و جل فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃ﴾

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے' نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے' اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے' یعنی

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ (بقرہ۔۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے طبری میں یہ دونوں قول ہیں' ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے' دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے' حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے۔

﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً مِّنِّيْ يَخْلُفُنِيْ فِي الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِيْ﴾

میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا' میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے۔

﴿ان اللّٰہ تعالٰی اخبر الملٰئکۃ انّہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیھا بین خلقہ بحکمہ﴾ (ص۱۰۴مصر)

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے۔

﴿والمراد بہ ادم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللّٰہ تعالٰی فی ارضہ و کذلک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس و تکمیل نفوسھم و تنفیذ امرہ فیھم لاحاجۃ بہ تعالٰی الی من ینوبہ بل لقصور قبضہ و تلقی امرہ بغیر وسط۔﴾

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں' کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے' اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گذری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے' یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے' اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا' اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی' لیکن جس اہتمام سے' جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش' اللہ کی نیابت' فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کئے گئے ہیں ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا' یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے' اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہو گی' اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی' اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہو گا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہو گی' جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا' اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے یا سیاق وسباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی' اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے' اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدمؑ کو نائب بنانا سمجھا جائے' ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف وکرامت کا اظہار ہوتا ہے' فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں' اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں' اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (تین: ۱)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لئے بنا ہے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (جاثیہ: ۲)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لئے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں۔

﴿ وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ (بقرہ: ۳)

اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ ﴾ (نمل: ۲)

اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ﴾ (جاثیہ: ۱)

اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ ﴾ (ابراہیم: ۵)

اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴾ (ابراہیم: ۵)

اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافت الٰہی کا منشاء ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ (احزاب: ۹)

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے یہ امانت الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و

اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چندروز کے لئے عاریت ملے ہیں' یہ حدیث کہ ﴿فان اللّٰہ خلق ادم علی صورتہ﴾ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ﴿تخلقوا باخلاق اللّٰہ﴾ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت وریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے اور جس کے اندر مادی وروحانی سیاسی اور اخلاقی' دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے' اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے' اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے' وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدہ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابت الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخرالامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں۔ [1]

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ o وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ (واقعہ۔۱)

ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں ہے۔

﴿ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾ (جمعہ)

اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز۶۔۲۳)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری و مسلم ونسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے۔

﴿ نحن الآخرون السابقون ﴾

ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر وثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز۶۔۲۳۰)

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر۔

ابن ماجہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا

﴿ نحن اخر الامم ﴾ (کنز ۶۔۲۳)

ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امت محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب ومنصور رہے گا' جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہو گا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا' اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے' اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کردے گا' گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب وعلل کا واسطہ رکھا ہے' اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا' اس کے بعد پورا فرمایا' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے تو وہ بھی اسباب وتدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہو گا' اسی لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے حاملین قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا' اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہو گا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے' ارشاد الٰہی ہے۔

﴿ وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ (انعام)

ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لئے ہے' یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔ [1]

قرآن پاک میں حضرت عیسٰیؑ کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران)

اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

حضرت عیسٰیؑ کے اصلی منکر تو یہود ہیں' گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں' اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو

---

[1] تفسیر خازن تفسیر آیت مذکور۔

مسلمان ہیں،[۱] مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں گو گمراہ ہوں،[۲] بہرحال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسٰیؑ کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزول مسیحؑ کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان ارشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

﴿لاتزال من امتی امة قائمة بامراللّٰہ لا یضرھم من خذلھم و لا من خالفھم حتی یاتیھم امر اللّٰہ وھم علی ذلك﴾ (بخاری، علامات النبوۃ)

میری امت کا ایک گروہ اللہ کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

﴿لایزال ناس من امتی ظاھرین حتی یاتیھم امراللّٰہ وھم ظاھرون﴾ (بخاری، علامات النبوۃ)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی۔

﴿لایزال من امتی قوم ظاھرین علی الناس حتی یاتیھم امراللّٰہ﴾ (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

﴿لایزال من امتی امة قائمة بامراللّٰہ لایضرھم من کذبھم و لا من خذلھم حتی یاتی امراللہ وھم علیٰ ذلك﴾ (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

﴿لاتزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق لایضرھم من خذلھم حتی یاتیھم امر اللّٰہ وھم کذلك﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

﴿لن یبرح ھذا الدین قائماً یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔

﴿لاتزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الیٰ یوم القیامه﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

---

[۱] تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ۔

[۲] تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ۔

میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا' اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

﴿ لاتزال طائفة من امتی قائمة بامر اللّٰه لا یضرهم من خذلهم او خالفهم حتی یاتی امراللّٰه و هم ظاهرون علی الناس ﴾ (مسلم' کتاب الامارة)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے' ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

﴿ ولاتزال عصابة من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاهرین علیٰ من ناواهم الیٰ یوم القیامة ﴾ (مسلم' کتاب الامارة)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی' اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

﴿ لاتزال عصابة من امتی یقاتلون علی امراللّٰه قاهرین لعدوهم لایضرهم من خالفهم حتی یاتیهم الساعة وهم علیٰ ذلك ﴾ (مسلم' کتاب الامارة)

میری امت کی ایک جماعت اللہ کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی' اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آ جائے' اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں' حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم' جامع ترمذی' سنن نسائی' ابو داؤد' ابن ماجہ' ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکین کی خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گی تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا' وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی' ایک حدیث ہے العلماء ورثة الانبیاء[2] یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں' ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں شامل نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ السلام کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا' بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا' اور وہ تبلیغ دین' ہدایت خلق' دعوت حق' اقامت دین' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دفع شبہات' ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں' چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہو گی' تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

---

[1] دیکھئے کنز العمال ج ۶ ص ۲۳۱' ۲۳۵۔

[2] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے اور محدثین نے اس لئے اس کو معتبر مانا ہے دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی ص ۲۴۔

﴿ كادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها ﴾ (مسند طیالسی، ص ۳۵۴، عن ابن عباس و مسند احمد و ابویعلیٰ)
قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شهداء على الامة یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا۔[1] یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے حضرت عبادہ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے۔

''اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (مومن:۶)
مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾
اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾
ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

''شہید اور شاہد'' کے لغوی معنی ''حاضر'' کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لئے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لئے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لئے، اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا۔

۱۔ حمایتی اور مددگار کے معنی میں۔

﴿ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ:۳)
اور اللہ کے سوا اپنے حمائتیوں کا بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)

---

[1] حافظ ابن کثیر نے قرآن کی دوسرے پارہ میں لتکونوا شهداء على الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

﴿ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰)

اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ﴾ (حج:۲)

اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ﴾ (مائدہ:۱۲)

(حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا، نگراں رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ (نساء:۶)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے

۵۔ امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (بقرہ:۱۷)

اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۲)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئی ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حامی، مددگار اور گواہ ہے وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر شہادت کی

صورت میں ظاہر ہوگی' جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح بلائے جائیں گے' وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب' پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی' وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈرسنانے والا نہیں آیا' تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا' تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت' تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے' یہ ارشاد فرما کر حضور انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا' تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (صحیح بخاری تفسیر سورہ بقرہ)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا نام یہاں مثالاً ہے' ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی' اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے' اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہوسکتا' کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جز ہے یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے' قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورہ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے۔

﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (حج۔آخر)

اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ ﷺ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے' اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی' تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین' اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا' اور اس قرآن میں بھی' تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں' اُمَّةً وَّسَطًا' (عادل و معتدل امت) خَيْرَ اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو اللہ نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری' اور فضیلت پر شاہد ہیں' بلکہ وصف اجتبا کم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' جو قیامت تک کے لئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں' اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں' وہ نبی ﷺ کی امت دعوت ہیں حضور انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا' آپ ﷺ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا' جب تک دنیا آباد ہے' ہر ملک میں' ہر قوم میں' دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ تا بہ قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے' یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے' جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے

حسب ذیل فرمائی ہے۔

''تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے' کہ اس نبی کو لوگوں کی تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے' تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے' (باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشاء یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے' اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے' دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے' اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں' اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ (جمعہ:۱)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (آل عمران:۱۲)

قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں' ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا:

﴿ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ ﴾

تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو' اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے' اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے' وہ اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے' اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے' حضور انور ﷺ کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم۔

﴿ فيبلغ الشاهد الغائب ﴾

(میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے' وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں)

صرف حضور انور ﷺ کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں' بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری و ساری ہے' فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے' ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے۔

﴿ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ (توبہ:۱۵)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ (دین کا علم سیکھتے' اور اس میں سمجھ پیدا

کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشاء اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گذر چکی ہے' جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آل عمران:۱۲)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو' اچھی باتوں کو بتاتے ہو' اور بری باتوں سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے' اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران:۱۱)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی' جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا اپنا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں' لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا' امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا' مگر انشاء اللہ یہ وعدہ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

﴿ إِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ﴾ (توبہ:٦)

اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

پھر فرمایا۔

﴿ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (مائدہ:۸)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں' یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی' اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی' اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی' کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی' اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی' اظہار حق میں کسی ملامت کی پروانہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورہ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے۔

﴿ یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ﴾ (حج:۱۰)

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو' اور نیک کام کرو تا کہ فلاح پاؤ اور اللہ کی (راہ) میں جہاد کرو' جیسا جہاد کرنے کا حق ہے' اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمھارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا' اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تا کہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوۃ دو اور اللہ کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو' وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

اس آیتوں سے اس شاہد امم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

ا۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی (۲) ادائے زکوۃ پر عامل (۳) ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط (۴) رکوع و سجود و عبادات الٰہی کی خوگر (۵) امور خیر پر حریص (۶) راہ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا' اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ وشوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوت عاملہ یا قوت آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے' اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے' کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو' انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا' اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا' جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا' پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی' تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا' ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے لئے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا' اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا' جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی' ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی' یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا' اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوت ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے' اور مصر کے فرعون اپنے کو رع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا' چین کے بادشاہ اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے' اسی لئے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (اللہ کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا' یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو اللہ کا اوتار کہتے تھے' ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔[1] اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے' یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا اللہ ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے۔[2] ولادت مسیحؑ کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے' اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔[3] یہودیوں میں حضرت داؤدؑ سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو اللہ کے کاہن اور اللہ سے الہام پاکر اللہ کے نام پر حکومت کرتے تھے' اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں' ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں' مثلاً اوتاری' شخصی' زعیمی' امرائی' دستوری' جمہوری۔

''اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے' یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود اللہ یا اللہ کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون یونان۔

[2] تاریخ روما ص ۳ دار الترجمہ حیدرآباد دکن۔

[3] ایضاً ص ۴۲۹۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو' دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے' جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعیمی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے' مثلاً جرمنی میں ہٹلر' اٹلی میں مسولینی' گو وہ بادشاہ نہیں تھے' مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا' فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لئے کسی مدت معینہ کے لئے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں' جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے' اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے' فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے' جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے' انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے' خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں' اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے' جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے' اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے' سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا' پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں' نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا' پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا' پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی' اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) ثابت کرنے کے لئے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس میں بیک وقت مذہبی' شخصی' دستوری' جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں' اس لئے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس

کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات وفضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح ومثالب سے خالی ہے اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط وخال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ اللہ ہے، نہ اللہ کا اوتار ہے، نہ اللہ کا مظہر ہے، نہ اللہ سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ اللہ سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی الٰہی تقدیس ہے، نہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اور ان کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزء کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام وفرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین وحکام اور سلطنت کے عمال کے قول وفعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق وعدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس

کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا' اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف اللہ کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت' زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں' لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے' اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

﴿ قال اللہ تعالیٰ: اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ﴾(یوسف:۸)

حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لئے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے نمرود وفرعون بن کر دعویٰ بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکام الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطین عالم کو اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام وفرامین کے آگے جب اللہ کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں۔

﴿ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ﴾ (یوسف:۸)

حکم نہیں، مگر اللہ کا۔

﴿ اَلَا لَهُ الۡحُکۡمُ وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحَاسِبِیۡنَ ﴾ (انعام:۷)

ہاں! اسی کے لئے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔

﴿ لَهُ الۡحُکۡمُ وَاِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ (قصص:۷)

اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امر تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان، اور خاک وبادو آب وآتش اور جسم وجان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے، اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی واضافہ کرسکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کردیا۔ فرمایا۔

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ﴾(بقرہ:۳۴)

تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔

حکومت وسلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطاء

اور بخشش سے ہوتے ہیں۔

﴿ اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ ﴾ (آل عمران: ۳)

اے اللہ سلطنت کے مالک تو ہے جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لئے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیئے ہیں ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکام الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع وضرر پر مشتمل ہوں' بے شبہ اہل عقل اپنی عقل وفہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے' بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے' یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے' اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لئے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے' اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لئے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو اللہ عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے' قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے' عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

﴿ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ﴾ (انعام ویوسف: ۸)

حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔

﴿ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ (اعراف: ۷)

ہاں اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے' پہلی آیت دو جگہ ہے' سورہ انعام اور سورہ یوسف میں' سورہ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے' اس کے جواب میں ہے:

﴿ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَھُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ ﴾ (انعام: ۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں' حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے' اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورہ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔

﴿ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ (یوسف:۸)

اور اللہ کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (اعراف:۷)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل اللہ کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔

﴿ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ﴾ (مریم:۵)

شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ﴾ (یٰسین:۴)

یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور آئمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکام الٰہی کی تبلیغ اجراء اور تنفیذ کے لئے حکم الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ (النساء)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت' خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکامِ اللہ کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے' اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے' جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ (نساء۔۸)

اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے' اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (نساء۔۷)

اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا' لیکن اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم اللہ سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے' ارشاد ہے۔

﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ (توبہ:۴)

اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں' بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (توبہ:۵)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے' اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً طور پر اللہ کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے' اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

﴿ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (آل عمران۔۷)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی

اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے' ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے' آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عدی نے کہا ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے'' فرمایا کیوں نہیں' انہوں نے ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا' یہی ان کا ان کو معبود بناتا ہے' الفاظ یہ ہیں ﴿فذالك عبادتهم ایاهم﴾ [1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے' لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے' یہی تو شرک ہے۔ [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں' بلکہ اللہ کا ہے' اور اسی کا نام وضع حکم ہے' اس تحلیل وتحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے' اسی طرح اللہ کے علاوہ یا اللہ کے حکم کے ساتھ بلاوساطت حکم الٰہی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے' یا ان کے فیصلہ کے لئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر وتوبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکام عدل وانصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ (نساء:۹)

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا' ایمان لا چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں' حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے ''کل معبود من دون اللہ'' اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں' جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے' اس لئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے' وہ طاغوت ہے قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (مائدہ:۷)

اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے' حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان

[1] تفسیر ابن کثیر۔
[2] ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرات گناہ اور عصیان ہے' اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں' اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ (طلاق:۱)

یہ اللہ کی بتائی ہوئی حدیں ہیں۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾ (طلاق:۱)

یہ اللہ کی بتائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا' وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورہ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ (نساء:۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں' اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے' اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا' اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزاء جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام ''افتراء علی اللہ'' اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے' ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ○ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (نحل:۱۵)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو' ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام' تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ' یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشینگوئی فرما دی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے' گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لئے عذاب ہی ثابت ہوگا' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے' اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر ہر حکم الٰہی ہے' لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لئے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ﴾ (تحریم:۱)

اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں' حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرما دیا' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لئے مخصوص نہ ہو امت کے لئے حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے' اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لئے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی' دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حق تشریع ہے' جو صحیح نہ ہوتا' اسی لئے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے' قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

﴿ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ﴾ (توبہ:۴)

اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے' رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے' جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے' اصول کا مسئلہ بن گیا ہے' چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں۔

﴿ اعلم انه لا حاکم سوی الله تعالی و لا حکم الا ماحکم به' و یتفرع علیه ان العقل لا یحسن و لا یقبح و لا یوجب شکر المنعم وانه لا حکم قبل ورود الشرع ﴾ (۱۱۳۔مصر)

جاننا چاہئے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے' اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا' اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے' اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے' اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون

قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کی رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے، علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں۔

﴿الحاکم لا خلاف فی انه رب العلمین﴾ (ص۸۹۔۲)

اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسلوی واضح کرتے ہیں۔

''حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لئے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے''۔ (ص۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں۔

''حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا'' (المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں۔

''اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے' تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون وحاکم عقل ہے' یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرات کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو' بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے''۔

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے۔

''اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے' اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو' یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے' نہ کفر حرام ہے' نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا (ص ۱۶' ارشاد الفحول' مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے۔

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں' اسی کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے' اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر' اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن وقبح کے ساتھ انصاف' امر ونہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر ونہی فرمایا ہے' عقل کبھی ان کے حسن وقبح کو معلوم کر لیتی ہے' تو اس موقع پر اس حسن وقبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں' لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن وقبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے'[1] اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے' اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ''قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے'' یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لئے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر ونہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے عقل کبھی اس حکمت ومصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں' ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشاء نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے' وہی ایک حاکم' آمر اور واضع شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں

---

[1] تہذیب منطق میں ایک مختصر متن کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لئے کیونکر ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول، وکلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا، تغیر وتبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جوانہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول وکلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تمنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آ جائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آ سکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول وفروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصولی کلی کے ماتحت ہے انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہائے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

تمت

الحمد للہ سیرۃ النبی ختم شد